ISSN : 2394-5567

سہ ماہی ادبی جریدہ

دبیر

(فارسی ادب کا ترجمان......)

جلد– دوم
شمارہ–اوّل
زرتعاون––۴۰ روپئے
جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء

از

دبیر حسن میموریل لائبریری، کاکوری، لکھنؤ

ISSN:- 2394-5567

صوفیاء کی زمین کاکوری سے فارسی ادب کا ترجمان............

دبیر

(سہ ماہی ریفریڈ ادبی جریدہ)

جلد:۔دوم

شمارہ:اول

جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء

زرتعاون:۱۰۰روپئے

مدیر:۔ احمد نوید یاسر ازلان حیدر

از:۔ دبیر حسن میموریل لائبریری ، کاکوری، لکھنؤ

مجلس مشاورت

۱۔ پروفیسر مسعود انور علوی، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
۲۔ پروفیسر محمد مظہر آصف، شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام
۳۔ پروفیسر عزیز بانو، صدر شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔
۴۔ احمد علی، کیپر (مینسکرٹ)، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ۔
۵۔ ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔
۶۔ ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی قادری رامپوری، خانقاہ احمدیہ، مسٹن گنج، رامپور۔
۷۔ ڈاکٹر عابد حسین، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔
۸۔ ڈاکٹر اخلاق احمد، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔
۹۔ ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ربانی، اے ایس آئی، ناگپور۔
۱۰۔ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔
۱۱۔ ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، شعبۂ فارسی، ایچ ڈی جین کالج، آرہ، بھوج پور۔
۱۲۔ ڈاکٹر افتخار احمد، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ۔
۱۳۔ سید عادل احمد، محکمہ آثار قدیمہ، آندھرا پردیش اسٹیٹ میوزیم، پبلک گارڈن، حیدرآباد۔
۱۴۔ ڈاکٹر محمد قیصر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اعلان

دبیر حسن میموریل لائبریری کے سہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر'' کی ہی طرح انشاءاللہ ہمارا سالنامہ ''کوکب ناہید'' بھی شائع ہوگا، جس کے لئے معزز اساتذۂ کرام وطلباء فارسی سے درخواست ہے کہ اپنے پرارزش مقالات سے ہماری معاونت فرمائیں۔ یہ سالنامہ ''فارسی تذکرہ نویسی'' اور ''فارسی مثنوی نگاری'' پرمحیط ہوگا۔

مصنفین سے درخواست ہے کہ اگر وہ اپنی تصانیف پر جو کہ فارسی ادب سے متعلق ہوں تبصرہ شائع کروانا چاہیں تو ہماری لائبریری کے پتے پر اپنی تصنیف کی دو کاپیاں ارسال کرنے کی زحمت کریں۔

آپ کے تعاون کا شکریہ! مدیر

ISSN:- 2394-5567

صوفیاء کی زمین کاکوری سے فارسی ادب کا ترجمان......

سہ ماہی ادبی جریدہ۔ **دبیر**

☆ جلد۔۲ ☆ شمارہ۔۱ ☆ جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء

زرتعاون:۔ فی شمار: ۴۰ روپئے، سالانہ: ۱۵۰ روپئے

☆سرپرست☆

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی

صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

☆نگران اعلی☆

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی

شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆نگراں☆

ڈاکٹر انجمن صدیقی (لکھنؤ)

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔ چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ مقالہ نگاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مقالے اردو ان پیج کی فائل میں ہمارے برقی پتے پر ارسال کریں۔

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس

شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید

شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر علیم اشرف خان

شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر مظہر عالم صدیقی

شعبۂ فارسی، اسماعیل یوسف کالج، جوگیشوری ممبئی

ڈاکٹر محمد عقیل

شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

محمد قمر عالم

شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی

ڈائرکٹر، مرکز تحقیقات فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر عبدالقادر جعفری

صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

پروفیسر شمیم اختر

صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

پروفیسر عراق رضا زیدی

صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی

صدر شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

☆معاون مدیران☆

نقی عباس کیفی، جے این یو۔ دہلی، **محمد توصیف خان کاکر**۔ اے ایم یو، علی گڑھ، **ارمان احمد**۔ بی ایچ یو، بنارس، **محمد جعفر**۔ جے این یو، دہلی۔ **مناظر حق**، اے ایم یو، علی گڑھ، **عاطفہ جمال**، لکھنؤ

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان مقالہ	مقالہ نگار	صفحہ نمبر
۱	**اداریہ**	مدیر	۵
۲	**کاکوری نامہ**	پروفیسر عمر کمال کاکوروی	۶
	مقالات		
۳	دہلی امیر خسرو کے کلام کی روشنی میں	پروفیسر عبدالقادر جعفری	۸
۴	علی ابراہیم خلیل اور انکی تذکرہ نویسی	پروفیسر شمیم اختر	۱۴
۵	غالب کے ایک معاصر امیر حسن خاں بسمل کاکوروی	پروفیسر مسعود انور علوی	۱۹
۶	مولانا رومؒ اور انکے کلام سے متعلق تاریخ گوئی	پروفیسر عراق رضا زیدی	۲۵
۷	فارسی زبان کی ہمہ گیر مقبولیت	پروفیسر طاہرہ وحید عباسی	۳۷
۸	رسوا ہری پوری کی فارسی غزلیات میں جمالیاتی حس	عبدالکریم	۴۰
۹	شیخ محمد ارشد جونپوری: شخصیت اور شاعر	ارمان احمد	۴۸
۱۰	بیداری ایران اور بیسویں صدی کا جدید فارسی ادب	سعدیہ جعفری	۵۱
۱۱	فارسی مثنوی نگاری: از عہد خلجیان تا عہد اورنگ زیب	محمد توصیف خان کاکر	۵۴
	دکنیات		
۱۲	جنوبی ہند کی قطب شاہی سلطنت	سید عادل احمد	۶۲
	آئینۂ تحقیق		
۱۳	پایان نامہائے شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	محمد ضیاء الحق	۶۸
	میراث خطی		
۱۴	نخلستان	احمد نوید یاسر ازلان حیدر	۷۶
	چشم بینش		
۱۵	تبصرے	مناظر حق بدایونی / محمد توصیف خان کاکر	۷۹

اداریه

انسانی معاشرے کا گہرائی سے تجزیہ کرنے کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ زمانۂ قدیم سے آج تک اس عالم رنگ و بو میں جو لوگ میدان عمل میں آئے ان کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو اپنی خدمات کے عوض نام ونمود اور شہرت ونمائش کا طلبگار رہا ہے دوسرا وہ جو خدمت خلق کے جذبے کے سرشار، ضرورت مندوں، مظلوموں، خستہ حالوں کا مددگار اور صلہ وستائش سے بے پرواہ خالق کائنات کے بندوں کی فلاہ و بہبود میں کوشاں رہا۔ ایسے خاموش خدمت گاروں میں بہت قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اس دنیائے فانی کو خیرآباد کہنے کے بعد لال وگل کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں اس جریدے کا نام جس شخصیت سے منسوب ہے وہ نہ کوئی جادو بیان مقرر تھے نہ صاحب طرز ادیب نہ شیخ وقت تھے اور نہ جید عالم دین نہ لاکھوں دلوں پر حکومت کرنے والے سیاسی رہنما تھے اور نہ صاحب دولت وثروت، ایک عام انسان کی طرح انہوں نے بھی فکر معاش کے ساتھ ساتھ اپنی خانگی اور معاشرتی زندگی میں گوناگوں مسائل کا سامنا کیا لیکن ان سب کے باوجود اپنی بساط بھر خدمت خلق، ہمدردی، مفاہمت، صلہ رحمی، عقربہ پروری، کسر نفسی اور رواداری کی جو مثال قائم کی وہ لائق ستائش بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ شعر وادب سے ان کی دلچسپی اور تعلیم سے ان کے شغف کا یہ تقاضا تھا کہ ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے سلسلے میں کوئی تخلیقی کام کیا جائے اس سلسلے میں ان کے انتقال ۲۵ جون ۱۹۹۰ء کے بعد ان کے آبائی رہائش گاہ واقع چودھری محلّہ، کاکوری میں ان کی جمع کردہ کتابوں پر مشتمل ایک لائبریری (دبیر حسن میموریل لائبریری) کے نام سے قائم کی گئی جس میں وقت گزرنے کے ساتھ اہم کتابوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس جریدہ کی اشاعت اس دیرینہ خواب کی تعبیر کی دوسری قسط سمجھنا چاہئے۔

ارباب علم وفضل اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ فارسی زبان عرصۂ دراز تک ہندوستان کی سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ عوامی زبان رہی ہے اور مذہب، تصوف، اخلاق، ادب اور دیگر علوم وفنون پر مشتمل تصانیف کا قلمی اور مطبوعہ ذخیرہ یہاں دستیاب ہے بہت سی فارسی تصانیف کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے مرور ایام کے ساتھ گفتہ و ناگفتہ وجوہات کی بناء پر فارسی زبان کی تعلیم وتدریس کی وہ رونق ماند پڑ گئی اور یہ اہم اور شیریں زبان جو حقیقت میں اسلامی دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے اپنی بقا کی جنگ میں مصروف ہے۔ اس زبان سے محبت رکھنے والوں نے خصوصی طور پر اس طبقہ کے لئے جو فارسی سے دلچسپی رکھنے کے باوجود اس زبان سے ناواقفیت کی بناء پر اس سے استفادہ کرنے سے قاصر ہیں ایک ایسے جریدے کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے جس میں فارسی زبان وادب سے متعلق مقالات اردو زبان میں شائع ہوں گے۔ مقام شکر ہے کہ اس حقیر کی ناچیز سعی کو فارسی زبان کے علماء وفضلاء نے شرف قبولیت بخشا جس کا ثمرہ یہ جریدہ قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔

مدیر

کاکوری نامہ

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی، صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

تقدس اور روحانیت کی فضاؤں سے معمور علم و فضل، شعر و ادب، شرافت و وضع داری، کے لئے مشہور شہنشاہ اثمار یعنی آم کے باغات سے محصور حب الوطنی، اعلاءِ کلمۃ الحق اور جذبۂ حریت کے لئے ظالم و جابر حکمرانوں کی نظروں میں مقہور، وطن عزیز کی خاطر زندان کی سختیوں سے لیکر فراز دار تک چڑھنے کی نسبت سے نازاں و مغرور، روشن و تابناک ماضی، منتشر و پراگندہ حال اور مستقبل کے پردۂ غیب میں مستور رہنے والی بستی گلزار پور معروف بہ کاکوری کا شمار اودھ کی ان بستیوں میں ہوتا ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ہمیشہ اہمیت کی حامل رہی ہیں۔

محسنؔ و ساحرؔ، بھگونت رائے راحتؔ، شاہ محمد کاظمؒ و شاہ ترابؔ علی قلندرؒ، ملتجی و ذوقؔ کے وطن سے شائع ہونے والے جریدہ کی اشاعت کا مقصد اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا جب تک اس میں کاکوری سے متعلق ایک مستقل گوشہ کا التزام نہ ہو اس سلسلے میں ''کاکوری نامہ'' کے عنوان سے اس گوشہ کا آغاز کیا جا رہا ہے جس میں کاکوری کی علمی، ادبی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے قارئین کرام کو واقف کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

به قربِ لکهنؤ جائیست معمور سوئے مغرب بکاکوری است مشهور

(منشی فیض بخش کاکوری)

خصوصا روز عیدین وادینه نماید شهر کاکوری مدینه

(منشی فیض بخش کاکوری)

میں اپنے نام کاکوری سے مشہور زمانہ ہوں میں حضرت شاہ کاظم کا مقدّس آستانہ ہوں

(ظہیر کاکوری)

اودھ کے قصبات میں قصبہ کاکوری ''قصبہ مردم خیز'' کے نام سے معروف تھا، سلطنتِ مغلیہ سے لے کر اودھ کی حکومت تک یہاں کے فرزند اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، برطانوی عہدِ حکومت میں بھی ان کو اہم عہدوں پر فائز کیا گیا، یہ قصبہ ہمیشہ علماء فضلاء، حکماء و ادباء، شعراء و وکلا اور دیگر صاحبان علوم و فنون کا مولد و مسکن رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق میں ان کی مذہبی، علمی، ادبی، ثقافتی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور اصلاحی سرگرمیوں کی داستانیں محفوظ ہیں۔ دیگر قصبات کے مقابلہ میں کاکوری کو یہ خصوصیت حاصل رہی کہ یہاں کے باشندوں نے کبھی اپنی وطنیت کو فراموش نہیں کیا اور وطن سے دور رہ کر بھی اس کی عظمت کے گیت گاتے رہے۔

قصبہ کی تعریف: اصطلاح عرب میں قصبہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بہ حکمِ بادشاہ یا بطورِ خود بہت سے ایسے امراء و رؤساء نے

اپنے محلّہ جات ایک دوسرے سے قریب اس طور پر آباد کیے ہوں کہ دشمن کے حملے کے وقت پورے طور پر حفاظت ہو سکے اور وقت پر ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکیں۔ مسلمان جن جن ممالک میں پہنچے وہاں ایسے ہی قصبات قائم کیے یہی ہندوستان میں بھی ہوا اور اس پر اضافہ ہوا کہ سلاطین اسلامیہ نے مزید تقویت کے لیے انہی قصبہ جات کو پرگنہ جات کا صدر مقام قرار دیا اور حکام و افواج کو مقرر کیا۔

''دورانِ تحقیقات حکامان بندوبست کو بھی یہی بات ثابت معلوم ہوئی چنانچہ بمقدمہ قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ سر ولیم کیسپر نے لفظِ قصبہ کی جو تشریح کی ہے وہ حکام بندوبست نے تمام قصبات کے لیے کافی سمجھی، چنانچہ وہی تعریف داخلِ رپورٹ آخری شتہ مسٹر ایچ۔ ایچ۔ بٹس ہوئی اور اب لفظِ قصبہ کی یہی قانونی تعریف ہے۔''

(تاریخ قصبہ کاکوری از قاضی خادم حسن صفحہ۔ ۱۷)

''قصبہ پرگنہ کا صدر مقام ہوتا تھا۔ ان قصبات میں عموماً ایسی مسلمان آبادیاں تھیں جو قدیم ہندو بستیوں و رقلعہ جات کی جگہ قائم کی گئی تھیں اور ایسی صورت سے بنائی گئی تھیں کہ حملہ آوروں سے بہ آسانی اپنا تحفظ کر سکیں۔ ان مقامات پر وہ مسلمان سردار مقیم ہوئے تھے جنھوں نے حملہ کر کے گرد و پیش کی آراضیات پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ یہ لوگ اس غرض سے پاس پاس رہتے تھے کہ وقت پر ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ یہاں سادات کی مساجد اور مقدّسین کی درگاہیں بھی ہوتی ہیں اور فوج دار مع اپنے لشکر و اعلیٰ عہدہ دارانِ سرکاری مثلاً قاضی و مفتی و چودھری و قانون گو پرگنہ رہتا تھا، اس کے علاوہ دیگر چھوٹے چھوٹے عہدہ دار بھی مقیم رہتے تھے، عموماً ان قصبات کے ساتھ بہت زیادہ آراضی ملحق نہیں ہوتی ہے اور جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ درختان ثمر دار سے ڈھکی رہتی ہے۔ ان قصبات میں ہر شخص اپنے مکانات مع آراضی کا مالک و قابض ہوتا ہے جس کے لیے اس کو محصول یا لگان کچھ نہیں دینا پڑتا ہے۔''

(تاریخ قصبہ کاکوری از قاضی خادم حسن صفحہ۔ ۱۹۔ ۱۸)

محل وقوع:

''قصبہ کاکوری من مضافات شہر لکھنؤ کا شمار اودھ کے مشہور مردم خیز قصبات میں ہے اس کا عرض البلد ۲۶ دقیقہ ۵۲ ساعت جانب شمال اور طول البلد ۸۰ دقیقہ ۴۸ ساعت جانب مشرق ہے۔ ۵ اہل ہنود کے عہدِ حکومت میں یہ خطّہ بالکل ویران تھا۔ پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں اس پر راجہ کنس والیٔ کسمنڈی کلاں کا قبضہ تھا''۔

(کسمنڈی کلاں:۔ کسمنڈی کلاں کاکوری کے شمال مغرب میں پانچ کلومیٹر دوری پر واقع قصبہ ہے۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ کسمنڈی از مولوی احمد علی صدیقی۔) (بقیہ آئندہ)

دھلی امیر خسرو کے کلام کی روشنی میں

پروفیسر عبدالقادر جعفری، صدر شعبۂ عربی و فارسی، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

شمالی ہندوستان کے شہروں نے تہذیبی مراکز کی اہمیت اس وقت حاصل کی جب منگولوں نے وسط ایشیا کے اکثر شہروں کو تباہ و برباد کر ڈالا ان شہروں کے عالموں، فنکاروں، اور شاعروں کی بڑی تعداد دہلی آ گئی اس وقت کی دہلی بقول ابن بطوطہ عالم اسلام کا سب سے بڑا شہر تھا جہاں دنیا کے گوشہ گوشہ سے لوگ آ کر جمع ہو گئے تھے اس میں بہت سارے لوگوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اس طرح دہلی میں ایک ہند اسلامی کلچر کی بنیاد پڑی۔ امیر خسرو سے قبل ہندوستان کی فارسی شاعری میں ہندوستان کی تمدنی حیثیت اور اندرون ملک کی رنگا رنگی کو باضابطہ مواد شاعری کے طور پر نہیں قبول کیا جاتا تھا اور وہ تمام کی تمام وسط ایشیائی رسموں، تلمیحوں اور ایرانی پھولوں سے مملو تھی، بجائے چما اور کنول کے لالہ و گلاب و نسترن کا استعمال ہوتا تھا، ہندوستانی چرند پرند یہاں کے بازار اور میلوں ٹھیلوں کی رونق گرم مسالوں کی خوشبو وغیرہ سب کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور شاعری کا پورا انحصار اس مستعار زندگی اور اس کے مناظر و کوائف پر ہوتا تھا جس سے ذاتی طور پر شعراء قطعاً نابلد تھے حقیقتاً یہ خسرو ہی ہیں جنہوں نے شعراء میں ہندی مزاج اور احساس ابھارا اور دیسی ہندوستانی اشیاء کا ثنا خوان بنایا(۱)۔ خسرو کی تحریر میں شعری اور نثری دونوں، سماجی نشیب و فراز، سیاسی عروج و زوال، تہذیبی و ثقافتی آداب و اطوار گویا تاریخ کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ ہم تک پہنچاتی ہیں اور ہمارے تاریخی شعور کو مہمیز لگاتی ہیں۔ خسرو کے نظریات و خیالات رنگ و نسل کے امتیاز سے بالاتر ہیں اور ان کی تصانیف اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ ان کے آفاقی ذہن اور ہندوستان اور خصوصاً دہلی کی ملی جلی تہذیب اور طرز زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ دہلی سے جو انس، محبت و عقیدت تھی وہ ان کے تجربات و مشاہدات کا نتیجہ تھی۔ خسرو نے اپنے فن کی شوخی سے رزم بزم، تاریخی تفصیلات، شہری زندگی، فنون، صنعتوں اور حرفتوں کا ایک مرصع و مکمل نقشہ کھینچا جس سے ان کی شخصیت اپنے تاریخی دور کی ترجمان بن گئی ہے ان کی نظم و نثر سیاسی اور سماجی تاریخ کا ایک مستند ذخیرہ ثابت ہوئی۔ اپنے زمانے کی سب سے بڑی اہم تہذیبی تحریک نے ان کے نغموں کو رس دیا اور قبول عام پایا، ان کا کلام وقت کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر انسانی ہمدردی، راحت اور لطف و لذت کا ایک لازوال کارنامہ ثابت ہوا اور ان کے تخلیقی کارنامے عوام کی میراث بن گئے اپنی تصانیف کے عظیم الشان آئینہ میں انہوں نے اپنے عہد کی زندگی، اس کی فکر اور اس میں بسنے والے عوام کے خوابوں اور تمناؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان کے تخلیقی کارنامے کئی اعتبار سے ان کے اپنے وطن اور خاص طور سے دہلی سے جڑے ہوئے ہیں وہ ہندوستان کی تاریخی تقدیر اس کی خوشیاں اور غم ہی ہیں جنہوں نے امیر خسرو کو شعر کہنے پر اکسایا یا بالفاظ دگر ان کا فنی اظہار وطن اور دہلی کی روایات اس کے کلچر اور ادب پر منحصر ہے انہوں نے اپنی نظموں کے لئے اکثر موضوعات حقیقی زندگی سے منتخب کئے ہیں اور ان میں انسانی حسیات کی ایک دنیا آباد کر دی ہے، امیر خسرو نے عام لوگوں کی زندگی کو اپنے فن میں سمویا ہے ان کی عظیم تصنیف ''اعجاز خسروی'' ایک تخلیقی تجربہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس تصنیف میں شہری زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی

گئی ہے(۲)۔ دلّی، دلی کی عمارات، وہاں کے موسموں، پھلوں، پھولوں، جانوروں اور اس زمانہ کی محفلوں کے تکلفات کا ذکر ہمیشہ کے لئے ایک دلآویز مضمون میں کیا ہے اس کارنامہ پر امیر خسرو نے جو فخر کیا ہے وہ بجا ہے انہوں نے جو کچھ دیکھا سمجھا اور لکھا وہ اس عہد کے سماجی حالات کے بارے میں ہیں ہمارے بیشتر موجودہ علم کا مستند ماخذ بن گیا ہے۔ انہیں شہر اور گاؤں والوں کے سماجی رسم ورواج سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی کہ سپاہ اور فن حرب سے۔ امیر خسرو نے اپنے مشاہدے کو وسعت دی زندگی کو ہر پہلو سے پرکھا اپنایا اور اپنے قلم سے رنگا رنگ نقش ابھارے یہاں تک کے ان کی شخصیت اپنے دور کی ترجمان بن گئی وہ شخصیت جو طرح طرح کے تجربوں کا رنگ جذب کر چکی تھی ان کی نظم ونثر سیاسی وسماجی تاریخ کا ایک مستند ذخیرہ ثابت ہوئی۔ حقیقتاً جن معنوں میں ابوریحان البیرونی آخری کڑی تھا عربوں کی تلاش ہند کے تین صدی طویل سلسلہ کی اسی معنوں میں امیر خسرو پہلی کڑی ہیں۔ ہندوستان کے نئے سیاسی حالات میں ہمدردانہ نقطہ نظر کی جس نے صوفیاء اور فارسی شعراء کی صف میں اپنا ترجمان پایا مثنوی نہ سپہر میں خسرو نے نجوم، ہیئت، لباس، تیر تلوار، مختلف زبانوں، گھوڑوں، کھیلوں، لوگوں، موسموں اور نسلوں کے بارے میں انبار لگا دیا ہے جس کی بدولت ہمیں اس زمانہ کی تاریخ معاشرہ ثقافت، زبان و ادب غرض یہ کہ ہر طرح کی اطلاعات فراہم ہوجاتی ہیں۔ کیقباد سے محمد تغلق تک ان کا تعلق براہ راست دربار شاہی سے رہا اس سے پہلے امیروں اور شہزادوں کے دامن فیض سے وابستہ رہے۔

غیاث الدین بلبن کے عہد میں چنگیز خانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا امیر خسرو اس سے بہت ناراض ہوئے اور ہندوستان پر اس حملہ کو آسمانی بلا، قیامت، سیل فتنہ اور بنیاد عالم میں رخنہ قرار دیتے ہوئے کہا:

واقعه است ایں بلا کز آسمان آمد پدید　　آفت است ایں یا قیامت کز جہاں آمد پدید
راه در بنیاد عالم داد سیل فتنه را　　فتنۂ کامل در ہندو کامسال در ہندوستان آمد پدید(۳)

اس فتنہ کو روکنے کے لئے ہندو اور مسلمان متحد ہو کر مقابلہ کرنے کو تیار ہوئے خسرو بہت خوش ہوئے اور کہا:

بروں شد دوی از سر ترک و ہندو　　که ہندوستان با خراسان یکی شد(۴)

امیر خسرو کی زندگی میں ہدوستان پر دس بار منگول حملے ہوئے جن میں سے چار بہت بڑے حملہ علاء الدین کے شروع کے پندرہ سال کے دوران ہوئے، آخری حملہ میں دو لاکھ فوج تھی دو بار دشمن دہلی فصیلوں تک آ گئے تھے اور وہاں سے پسپا ہوئے۔ خسرو کے نزدیک ان فتوحات میں علاء الدین خلجی پالیسی، مردانگی اور طریق جنگ کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاء کی دعا بھی شامل تھی علاء الدین کے حصے میں فتح وکامرانی کے بیس سال آئے اور چوراسی جنگیں اسے پے در پے کئی غیر معمولی فتوحات بھی حاصل ہوئیں۔ ان فتوحات میں ترکوں افغانوں نومسلم راجپوتوں اور ان سورماؤں کا ہاتھ تھا جنہیں ذاتی قابلیت اور مختلف تدبیروں سے نیا نیا سیاسی اقتدار حاصل ہوا تھا فوجی مہموں سے فراغت حاصل کر کے علاء الدین سلطنت کے انتظام وانصرام میں منہمک ہو گیا تاجروں اور سوداگروں کے پاس زیادہ روپیہ جمع ہونے کی روک تھام یوں کی گئی کہ سرکار کی طرف سے سب چیزوں کے نرخ مقرر کر دئے گئے اور دہلی میں ایک بازار یا منڈی

''دارالعمل'' کے نام سے بنائی گئی جس میں چیزیں مقررہ قیمت پر ملتی تھیں ناجائز قیمت اور ناجائز منافع کمانے والوں کے لئے سخت سزائیں مقرر تھیں اس قسم کا ترقی پسندانہ معشیت کا نظام اس زمانہ میں علاءالدین یا اس کے وزیروں کو سوجھنا بڑی حیرت کا مقام ہے (۵)۔ خسرو نے فتوح مغلوب اور تباہ حال ہندوستان کی صناعی ذہنی اور فنی کمال تہذیبی گہرائی اور رنگارنگی کے جلوے دکھلائے پھر یہ جانا کہ چھوٹے چھوٹے رجواڑوں اور تہذیبی اکائیوں کو بزور شمشیر مٹا کر تاراج کر کے جو سیاسی اور انتظامی وحدت قائم ہوئی ہے وہ دیرپا نہیں ہوئی۔ بیرونی حملوں اور مرکزی حکومت میں معمولی خلفشار کے ظاہر ہوتے ہی ہر طرف شورش اور بغاوت کے شعلے اٹھنے لگتے ہیں۔ علاءالدین خلجی نے دور و نزدیک کی ان سیاسی و تہذیبی منڈیریوں کو مسمار نہیں کیا انہیں مرعوب یا مغلوب کر کے ساتھ ملایا تب علاقوں کے بجائے ملک کا ایک نقشہ ابھرا اور سرحدیں محفوظ رہ سکیں اور اندرونی نظام کے امن میں بیرونی حملوں سے نمٹنے کا سامان مہیا کیا۔ علاءالدین نے دیوگری (دولت آباد) پر چڑھائی کر دی اس نے سن رکھا تھا کہ اس شہر میں جواہرات اور زر و مال کی فراوانی ہے چنانچہ دشمن کو ہزیمت دیتا ہوا بے انتہا زر و مال لوٹا۔

۴ جنوری ۱۳۱۶ء کو علاءالدین کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ ۱۸ اپریل ۱۳۱۶ء کو دہلی کے تخت پر بیٹھا اس دوران میں کئی نشیب و فراز آئے اور اسی دوران امیر خسرو نے اپنا پرحسن کارنامہ ''مثنوی دول رانی خضر خاں'' تصنیف کی جو عشقیہ مثنوی کے بجائے ایک سماجی تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔ آئین سکندری اور تاریخ علائی یا خزائن الفتوح علاءالدین خلجی کی فتوحات کی تفصیل ہے دونوں کتابیں عہد علائی کا بہت اچھا تاریخی مآخذ ہیں۔ آئین سکندری میں علاءالدین کی تعریف کے ساتھ خسرو نے انہیں نصیحت بھی دے ڈالی کہتے ہیں:

جهانگیری گر چه جهان خواری است		ولی پادشاهی جهان داری است
جهان گیر همچو جهان دار نیست		کمان کش مخوان چون کماندار نیست
همین فرق شد در دو صاحب کلاه		که این پهلوان است و آن پادشاه
نه آسان است بر تخت ره داشتن		جهان را بیك تن نگه داشتن

''جہان را بہ یک تن نگہ داشتن'' کا اصول غالباً علاءالدین پر اثر انداز ہوا اور ہندوستانی تاریخ میں پہلی بار ایک سیکولر حکومتی نظام کے نقش ابھرے اس کا ثبوت تو یہ ہے کہ علاءالدین نے شرعی حکومت کی جگہ ضوابط کی حکومت قائم کر کے سیکولرزم کا پرچم لہرایا لیکن اس کی کوئی براہ راست شہادت نہیں ہے کہ یہ کام اس نے خسرو کے زیر اثر کیا (۶)۔

علاءالدین کا قیمتوں پر کنٹرول والا قانون عوامی مفاد میں نہیں تھا کیونکہ اجرت بہت کم تھی اور محدود تھی اور اس کا زیادہ تر فائدہ دہلی کی شہری آبادی کو ملتا تھا، دہلی میں دولت و ثروت و مال غنیمت کی مسلسل آمد کی وجہ سے تاجروں اور حرفت پیشہ (دستکاروں) طبقہ میں تفریق رہی۔ نومسلم غلاموں کی بڑی تعداد اگر چہ شاہی کارخانوں میں موجود تھی مگر ہنرمند پیشہ وروں کو سماجی مرتبہ ترقی کی اجازت نہیں تھی۔

غریب مسلمان جن کا دار و مدار چھوٹے موٹے کاروبار اور بیوپاریوں پر تھا ان کا شمار سوسائٹی کے سب سے پچھڑے طبقے میں ہوتا تھا اس دور میں دہلی میں ایک نئے صنعتی نظام کی بنیاد پڑ رہی تھی یہاں مختلف جگہوں سے دستکار اور ہنر مند آ کر جمع ہو رہے تھے یہیں پر قلعے اور شاہراہیں تھیں جو بین الاقوامی تجارت کے لئے استعمال کی جاسکتی تھیں یہاں فوجیں سرکاری حکام اور مذہبی پیشوا موجود تھے شہری آبادی کا ایک حصہ سوداگروں مہاجنوں وغیرہ پر مشتمل تھا لہٰذا کوئی تعجب نہیں کہ یہاں معاشی استحصال کے مواقع فراہم ہو گئے ہوں اور ذات بندی کی تفریق کی لعنت سے بھی لوگ دوچار ہو چکے ہوں جیسے کہ نچلی ذات کے بیوپاریوں کو اونچے طبقے کے مسلمانوں کے مقابل الگ رکھا جاتا تھا (جیسے ہندو میں چاروں تھے) ساتھ ہی ساتھ یہاں نچلے طبقے کے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو جاگیرداروں اور امراء کی خدمت کرتے تھے اور باربرداری، بہشتی، خاکروب، گائے والے، پہلوانوں، رقاصاؤں اور حکیموں کے پیشے سے وابستہ تھے۔ شہر میں پڑھے لکھے لوگوں کا ایک طبقہ موجود تھا جن میں اہل علم فن کار علمائے دین اور شعراء وغیرہ تھے۔

اس دور میں شہروں میں جاگیردارانہ طرز زندگی کے خلاف ردعمل زور پکڑ رہا تھا تیرہویں صدی میں معاشی میدان میں تجارت اور صنعتوں کو ترقی ہو رہی تھی دوسری طرف مذہبی فرقوں کے رجحانات کے علاوہ تصوف کے بھی رجحانات فروغ پا رہے تھے علاوہ ازیں ابھی تک چشتی شیوخ نے تصوف میں جمہوری اثرات قائم کر رکھا تھا اس میں شک نہیں علاء الدین کا بیٹا خضر خاں اور دوسرے امراء سلسلہ چشتیہ میں ہونے کے باوجود جاگیردارانہ نظام کے حامی تھے۔ نظام الدین اولیاءؒ کا عوام الناس پر بہت اثر تھا اور انہوں نے جمہوری روایات بھی قائم کر رکھی تھیں۔ تیرہویں صدی کے سماجی زندگی میں تصوف کے رول کو یکطرفہ حیثیت نہیں دی جاسکتی کیونکہ مختلف رجحانات سلسلہ ایک ہی سمت یا لائن پر کام نہیں کر رہے تھے اس کی وجہ اس وقت کے سماجی حالات میں امیر خورد لکھتے ہیں کہ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی خانقاہ کے دروازے تمام لوگوں کے لئے کھلے رکھے تھے خواہ غریب ہوں یا امیر مالک ہوں یا فقیر عالم ہوں یا ان پڑھ، شہری ہوں یا دیہاتی، آزاد ہوں یا غلام، فوجی ہوں یا غیر فوجی (۷)۔

دہلی سلطنت کے ابتدائی برسوں میں ہندوستان کے کچھ شیوخ (سب سے پہلے سہروردی سلسلے کے شیخ) نہ صرف یہ کہ زمینوں کے مالک تھے بلکہ حکمرانان وقت اور امراء نے بطور ہدیہ کچھ گاؤں بھی دئے تھے جو لگان سے مستثنیٰ تھے جس کا حوالہ تاریخ کی کتابوں میں اور مشہور مورخ برنی کے یہاں بھی ملتا ہے اس کے برخلاف چشتیہ سلسلۂ اپنے رجحانات کے اعتبار سے جمہوری رہا ہے چشتی سلسلہ کے شیوخ نے ابتدائی تصوف کی نظری اور عملی تعلیمات کی پیروی کی اس کا ثبوت فقر، قیام، طریقت، سلوک وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات سے فراہم ہوتا ہے۔ چنانچہ فقر کے سلسلہ میں چشتی سلسلہ کے شیوخ کا نقطۂ نظر ان کے مختلف اقوال سے ظاہر ہوتا ہے ہندوستان میں کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی جاتی جس میں عہد علائی کے واقعات کی سند کے لئے امیر خسرو کی تصانیف خصوصاً ''خزائن الفتوح'' کو گواہ نہ بنایا جائے۔

مثنویات لکھتے وقت خسرو کا ذہن عوام اور ان کے مسائل سے قریب ہو چکا تھا مخلوق اور خالق کے نازک ترین رشتے پر اب

صوفیانہ تصورات کی شکل میں ان کے دل و دماغ پر چھا چکے تھے انسان دوستی ان کی شخصیت کا جز و بن چکی تھی آئینہ سکندری میں خسر و سماجی اونچ نیچ پر اپنے رنج وغم کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

یکی خورد در خواب نان و کباب یکی را نیامد خود از ناقه خواب(۸)

خسرو کے قلمی کارنامے اس دور کے تاریخی حقائق اور سیاسی حالات کا خاکہ پیش کرتے ہیں ان کے یہاں نسلی، مذہبی، سماجی اونچ نیچ کا رجحان یکسر نہ تھا جب ہم اس دور کے سماج میں مقررہ درجہ بندی اور جوڑ توڑ کا مطالعہ ومشاہدہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ان کی ایک شوخ اور منفرد تصویر ابھرتی ہے خسرو کی نظر میں نہ مذہب وجہ امتیاز تھا نہ کچھ اور بلکہ ہر وہ شخص شریف و عالی مرتبہ تھا جو اپنے پیشے کا وفادار اور مخلص ہو۔مثنوی دول رانی خضر خان اور نہ سپہر عام معاشرتی تہذیبی حالات کا عصری ماحول کا اور عام پیشہ وروں ہنر مندوں شہری تاجروں دیہاتی بندوں کی زندگی کا رنگین البم ہے(۹)۔

علاء الدین کا بیٹا خضر خاں دول رانی پر عاشق ہو گیا دونوں کی شادی کرا دی گئی اسے خسرو نے مثنوی کا جامہ پہنایا چونکہ اس کا پس منظر ہندوستانی تہذیب ومعاشرت اور ہندوستانی زندگی سے متعلق ہے اس لئے یہ مثنوی بہت مقبول ہوئی اس مثنوی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کی تاریخ وجغرافیہ تہذیب وتمدن اور رسم ورواج کی نسبت نہایت تفصیلی اور قیمتی معلومات ملتی ہیں۔شروع میں پورا ایک باب ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر لکھا ہے اس میں سلاطین اسلام کا پورا سلسلہ سلطان معزالدین سام سے شروع ہو کر جو دہلی میں اسلامی سلطنت کا بانی تھا سلطان علاء الدین تک ملا دیا اس کے بعد علاء الدین خلجی کی فتوحات کو بیان کیا(۱۰)۔قران السعدین میں خسرو کے فن کی شوخی کے ساتھ رزم بزم تاریخی تفصیلات شہری زندگی فنون اور صنعتوں کا ایک مرصع اور مکمل نقشہ ہمیں دستیاب ہوتا ہے قرالسعدین میں دہلی کے حالات بیان کرنے کے لئے ایک مثنوی ''درصفت دہلی''لکھی جس میں کہا کہ اس کے دین وانصاف کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے یہ عدن کی حیثیت رکھتی ہے اپنی خدمات اور خصوصیات میں باغ ارم سے مشابہ ہے:۔

چرخ به زیر است وحصارش بزیر

اس کے قلعہ کی تعریف میں کہتے ہیں:

چرخ نداند در و دیوار کس تکیه به دیوار و درش کرده بس

یہاں تک کہتے ہیں کہ:

گوشه ہر خانه بہشتی شگرف گشته به صنعت زربی صرف صرف

دہلی کے لوگوں کے اخلاق کے متعلق بتاتے ہیں کہ یہاں کے لوگ فرشتہ سیرت اور خوش دل وخوش خو ہوتے ہیں:

مردم او جمله فرشته سرشت خوش دل و خوش خو چو اہل بہشت

کہتے ہیں یہاں کے لوگ صنعت علم وادب آہنگ وساز نغمہ وسرود نیزہ بنگاہ اور تیراندازی میں بے نظیر ہیں۔

خضر خاں کے زمانہ میں خسرو نے مثنوی نہ سپہر لکھی خضر خاں نے فتح دکن لکھنے کے لئے خسرو سے کہا اس مثنوی میں نو باب جدا گانہ بحروں میں ہیں تیسرے باب یعنی تیسرے سپہر میں ہندوستان کی عظمت بہت تفصیل سے بیان کی ہے یہاں کے مرد و چرند و پرند جانور زبانیں پھل پھول علم و عقل الغرض ہر چیز کا بیان ہے بادشاہ کو مثنوی پسند آئی اور اس نے انہیں خوب نوازا خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں جشن نوروز کے بیان میں دہلی کا حسن، دولت، زیورات، آرائش، کھیل، تماشے، شعبدے، غرض جو کچھ اس وقت دہلی میں موجود تھا سب کا نقشہ نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے دہلی کی سماجی ثقافتی حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے تقریباً چار سو اشعار میں دہلی اور اہل دہلی کی حمایت میں علمی دلیلیں پیش کی ہیں جتنی سنجیدگی اور کرید سے البیرونی ۱۰۴۸ء میں ہندوستان اور ہندوستانی سماج اور اس کے علوم وفنون کی تلاش کی تھی اور جن نتیجوں پر وہ پہنچا تھا تین سو برس بعد امیر خسرو بھی اسی راہ سے انہی نتیجوں پر پہنچے فرق یہ ہے کہ وہاں علمی تلاش رہنما تھی اور یہاں شاعرانہ بصیرت۔

خسرو کے نزدیک اس دور کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے زمانے میں غریب اور پست حال کسان زمینداروں اور صوبیداروں کی زبردستیوں سے محفوظ ہے اور جنگ کے زمانہ میں لشکر کی گزرگاہ کے قریے، دیہات اور شہر لوٹ اور بے آبروی سے محفوظ ہیں ان کے نزدیک اس دور کی اہمیت یہ ہے کہ جہاں گیری کے ساتھ جہان بانی بھی ہے۔

خسرو کے کارنامے گہری انسان دوستی کی نشاندہی اور جمہوری سمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اس وقت دہلی میں پائے جاتے تھے باہمی موانست اور یگانگی جو کئی صدیوں سے دہلی میں موجود ہے اس کا نقشہ کھینچتے ہیں:

کردہ مرا خراب و سرمست این مغ بچگان تاک زادہ

بربستہ شان بموی مرغول خسرو چو سگیست در قلادہ

پس بغیر کسی تردید وتردد کے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور خصوصاً اہالیان دہلی کے آداب زندگی، معاشرت، ثقافت اور سیاست سے متعلق معتبر اطلاعات کے لئے خسرو کی اعجاز خسروی اور ان کی مثنویاں ایک گران بہا خزانہ ہیں اور عہد وسطیٰ کی تاریخ کے طالب علموں اور اساتذہ کے لئے سرمایۂ حیات بھی۔

منابع و مراجع:۔

(۱) خسرو شناسی۔ ظ انصاری، ص ۱۳۸، (۲) جہان خسرو۔ فاروق ارگلی، ص ۳۵۵، (۳) دیوان وسط الحیات۔ امیر خسرو، ص ۱۶۱، (۴) قران السعدین۔ امیر خسرو، ص ۶۲، (۵) امیر خسرو عہد فن اور شخصیت۔ عرش ملسیانی، ص ۶۶، (۶) خسرو نامہ، مجیب رضوی، ص ۲۳، (۷) حضرت امیر خسرو دہلوی۔ پروفیسر محمد حبیب، ص ۳۳، (۸) خسرو نامہ۔ مجیب رضوی، ص ۴۴، (۹) خسرو کا ذہنی سفر۔ ظ انصاری، ص ۷۵، (۱۰) جہان خسرو فاروق ارگلی۔ ص ۴۵۷

☆☆☆

علی ابراهیم خلیل اور انکی تذکرہ نویسی

پروفیسر شمیم اختر، صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

بنارس عہد قدیم سے ہی علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ جہاں سنسکرت زبان وادب کی درس و تدریس کا سلسلہ جاری وساری رہا وہیں فارسی ادب نے بھی ترقی کی۔ بنارس کی سرزمین اور آب وہوا میں اہل بنارس نے بھی لایق ذکر خدمات انجام دیں۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی تذکرہ صحف ابراہیم کے مؤلف علی ابراہیم خان خلیل بھی ہیں۔ علی ابراہیم نام، تخلص خلیل، لقب نواب امین الدولہ خان بہادر ناصر جنگ تھا۔ موصوف کا سلسلہ نسب بارہویں پشت میں شیخ شمس الدین فریادرس تک پہنچتا ہے۔ شیخ شمس الدین حضرت مخدوم جہانگیر سمنانیؒ کے عہد میں ہندوستان آے جو ایک صوفی تھے۔ شیخ شمس الدین حضرت مخدوم اشرف کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان کا انتقال ۹۰۷ھ میں ہوا موصوف کا مزار آج بھی زیارت گہ خاص و عام ہے۔ شیخ شمس الدین کے انتقال کے بعد انکی اولاد میں شیخ منجھو صوبہ اودھ سے ہجرت کر کے بہار چلے گئے۔ جہاں انکے ہی خانوادہ کے ایک شخص مصطفیٰ بہار کے ہی ایک قصبہ شیخو پورہ یا شیخ پورہ میں آباد ہو گئے۔ شیخ ابراہیم کے والد محمد رضا شیخ مصطفیٰ کی اولاد میں سے تھے۔ شیخ مصطفیٰ عظیم آباد الحال پٹنہ جا کر آباد ہو گئے۔ شیخ ابراہیم کی ولادت ۱۱۴۸ھ میں عظیم آباد میں ہوئی۔ انکے والد کا نام خواجہ عبدالحکیم تھا۔(۱)

علی ابراہیم کی عمر تقریباً سات سال کی تھی کہ موصوف سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ انکی تعلیم وتربیت انکے خالو داؤد علی خان عرف زائر حسین (۲) کی سایہ عاطفت میں ہوئی۔ زائر حسین زائر کے سلسلہ میں مزید تفصیل معلوم نہیں۔ تاھم جو کچھ انکے تعلقات اور احوال سے ظاہر ہے کہ موصوف ایک صاحب علم وفضل شخص تھے۔ نیز صاحبان اقتدار سے بھی اچھے مراسم تھے۔ علی ابراہیم نے اپنے خالو زائر حسین زائر کی خدمت میں مرشد آباد میں رہکر تعلیم حاصل کی۔ ۱۱۶۱ھ میں داؤد علی عرف زائر حسین خان کو حج بیت اللہ کے دیدار کا شوق پیدا ہوا۔ اپنی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کی غرض سے اپنے دوست ناظم بنگال و بہار نواب علی وردی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ موصوف سے انکے روابط بہت گہرے تھے بلکہ دوستانہ تعلقات تھے۔ نواب موصوف نے زائر کی بہت پزیرائی کی۔ اس موقع پر علی ابراہیم بھی ہمراہ تھے۔ زائر حسین نے نواب علی وردی کی خدمت میں علی ابراہیم کو پیش کیا اور اپنا مقصود ظاہر کیا۔ زائر حسین کی سفارش پر نواب مزبور کی سرپرستی میں مرشد آباد میں ہی رہکر اپنی تعلیم مکمل کی۔

۱۱۷۴ھ میں جب انگریزوں نے میر جعفر کو معزول کر کے بنگال و بہار کی نظامت میر قاسم کے سپرد کر دی تو میر قاسم نے علی ابراہیم کی فہم وفراست اور علمی استعداد کے پیش نظر اپنا مشیر منتخب کیا نیز داروغہ کے عہدے پر فائز کر دیا۔ ڈاکٹر اختر اورینوی اپنی کتاب ''بہار میں اردو کی ارتقا میں رقم طراز ہیں کہ میر قاسم نے ان کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ جہاں وہ اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ میر قاسم کے ستارۂ جاہ وجلال کے غروب کے بعد علی ابراہیم نواب شجاع الدولہ نواب اودھ کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ مگر اس وقت علی ابراہیم خان زیادہ

دنوں تک بنارس نہ رہکر مرشدآباد چلے گئے۔ اوضاع سیاسی میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں اور ۱۱۷۷ھ میں انگریزوں نے نواب نجم الدولہ کو بہار و بنگال کی نظامت سپرد کی اور محمد رضا کو صوبہ کا نائب مقرر کیا۔ محمد رضا خان نے اپنی نیابت کے لئے علی ابراہیم کو منتخب کیا۔

۱۱۸۳ھ میں نواب مظفر جنگ کی پانچویں اولاد مبارک الدولہ اور علی ابراہیم خان کے مابین اختلافات پیدا ہوگئے چنانچہ علی ابراہیم خان اپنے عہدے سے مستعفی ہوکر امورمملکت سے الگ ہوکر اپنے علمی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ صحف ابراہیم کے دیباچہ میں خودموصوف نے تحریر کیا ہے کہ -

''باهمه افزونی مشغله اوقات فرصت رابمطالعه تصانیف علما وفضلا و عقلا ودواوین شعر اء بسر آورده''۔ (۳)

۱۱۹۵ھ میں لارڈ ہیشنگ بحثیت گورنر جب ہندوستان آئے اور انکے علی ابراہیم خلیل کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم ہوئے تو موصوف کی دور اندیشی اور فہم وفراست نیز علمیت سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں اوصاف حمیدہ کے سبب اپنے ساتھ لکھنؤ لائے۔ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ نے انکی بڑی پزائی کی، خلعت فاخرہ عطا کیا۔ بعدازاں شاہ عالم نے ۱۱۹۹ھ میں علی ابراہیم خلیل کو امین الدولہ عزیز الملک نصیر جنگ کے لقب سے نوازا نیز جاگیر بھی عطا کی۔ یہ زمانہ علی ابراہیم خلیل کے لئے نہایت افاہ وآرام کا تھا۔ زندگی عیش وسکون سے گزررہی تھی۔ اس ضمن میں خود علی ابراہیم رقم طراز ہیں کہ-

''سالها گزشت که سر انجام این امر عظیم و مقدمه جسیم میسر نه گشت تا آنکه ظل سبحانی زیب افزائی اورنگ جهان بانی شاه عالم خلد الله ملکه بآبیاری توفیق خالق بیچون وبهمو ن سایه افضال فرمان روامی کن فیکون این گلین امید سرزمین بلده بنارس روی شگفتگی دید شجر کهن سال تمنای دیرین بنوید نیك سر انجام حلاوت بخش کام طلب گردید۔(۴)

علمی مشاغل کی مصروفیت کے ساتھ وہ امورمملکت کے بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۲۰۶ھ میں یعنی لارڈ ہیسٹنگ کے عہد میں ہی بنارس کے شعبہ عدلیہ کے عہدے پر مامور ہوئے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے دوہزارروپیہ ماہانہ مقرر ہوا۔ کارنوالس نے انہیں بنارس کا گورنر مقرر کیا۔ اس طرح بنارس میں نہایت آرام وپرسکون کی زندگی گزارتے ہوئے ۱۲۰۸ھ میں اس دارفانی سے کوچ کیا۔ علی ابراہیم کا مزار شاعر متاخرین شیخ علی حزیں کی آرامگاہ کے پہلو میں واقع ہے۔ محمد علی تمنا جو علی ابراہیم خلیل کے عہد میں منشی گری پر فائز تھے اور مرحوم سے گہرے رابطہ بھی تھے، انکی تاریخ وفات کہی۔

دل شوربده سال فوتش گفت لو آه مٹا مطلع دیوان عدالت

ڈاکٹر علی رضا نقوی نے موصوف کی تصانیف وتالیف کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

ا۔ صحف ابراہیم۔ ۲۔ خلاصۃ الکلام۔ ۳۔ گلزارابراہیم۔ ۴۔ وقایع جنگ مرہٹہ۔ ۵۔ دیوان اردو۔

۶۔ رسالہ شورش راجہ چیت سنگھ۔ ۷۔ مجموعہ مکاتب۔

علی ابراہیم خلیل نے تمام عمر اپنی عالمانہ فطرت اور طبع شاعرانہ کے مطابق معروف شعرائے متقدمین ومتاخرین کے کلام کی جمع آوری کرتے رہے اور تقریباً ۶۰ سال کی عمر عزیز کے پہنچنے تک انھوں نے ان اشعار کی ترتیب کا کام شروع کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے خود صحف ابراہیم کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ :

''از آنجا کہ شرط اعظم در تالیف تذکرۂ شعرا جمع کردن ابیات بلیغ و فصیح وصراحت احوال معنی سنجان بروایت صحیح است نہ بناء علیہ تا وسیع مقدور در تحقیق مولد ومنشاومدفن وزمان ظہور و سال ارتحال و نمایش رتبۂ کلام و علان قدر و منزلت ہر کدام از این طایفۂ فرجام مجوز تقصیر و تساہل نگشتہ از کتب سیر واخبار وتذکرہ ہای متولہ استنباط این مراتب نمودہ است ودر مواقع اختلاف اقوال تدقیق درکار داشتہ قول معتبر را خود خوردہ شناس بصحت و صواب آن طمانیت پزیرفت اختیار کردۂ چہ ہنگام تسوید این اوراق ہفتادو دو جلد از مصنفات متقدمین ومتاخرین کہ شمر دن آنہا بطول می انجامد مہیا بود۔ (۵)

عبارت بالا سے واضح ہے کہ ان تمام جمع آوردہ اشعار کی تعداد لاکھ یا اس سے تجاوز ہو چکی تھی۔ موصوف نے مذکورہ تذکرے کے اشعار نہایت انصاف اور دیانت داری سے منتخب کئے تھے۔ شعرا کے احوال میں بھی نہایت تدقیق وتحقیق برتنے میں کوئی تساہلی نہیں کی بلکہ ہر ممکن کوشش سے ان کے صحیح واقعات زندگی کی تلاش وجستجو میں لگے رہے، اور جب بنارس میں مصروفیات زندگی نے انہیں موقع فراہم کیا تو انہوں نے تذکروں کی ترتیب کا کام انجام دینا شروع کیا۔

خلاصتہ الکلام۔ ابراہیم خلیل خان نے جن تذکروں کی ترتیب دی ان میں خلاصتہ الکلام کی اہمیت نہ صرف فارسی گوشعرا کی حیات اور کارناموں کے لئے اہم ہے بلکہ تاریخی اور سیاسی احوال کے لئے بھی اہم ہے۔ اس تزکرے میں تقریباً ۷۸ شعرا کے حالات اور انکے اشعار قلم بند کئے گئے ہیں۔ کتاب تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان میں ڈاکٹر علی رضا نقوی رقم طراز ہیں کہ مزکورہ تذکرہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول حکیم اسدی طوسؔی سے شروع ہوکر جمال الدین ضمیرؔی کے احوال اور انکے اشعار پر تمام ہوتا ہے اور جلد دوم کا آغاز ملا صغرائؔی مشہدی سے شروع ہوکر ''محسن کاشؔی'' کے حالات پر اپنے اتمام کو پہنچتا ہے۔ تذکرہ اگر چہ دو جلدوں پر مشتمل ہے تاہم ان میں بیشتر بڑے شعراء کے حالات مثلاً شیخ علی حزیؔں، عطاؔر و روؔمی کے احوال فقط چند سطروں پر محدود ہیں۔ علی ابراہیم خلیل نے شعرا کے احوال تو مختصر تحریر کئے ہیں مگر انکے اشعار کی تعداد کافی ہے۔ احوال کے سلسلہ میں عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر چہ موصوف نے نہایت تلاش وجستجو اور احتیاط سے کام لیا ہے مگر اکثر شعرا کی تصانیف تاریخ ولادت وغیرہ اہم معلومات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

طرز تحریر نہایت شگفتہ اور حسب موقع مسجع ومقفع اور پر تکلف ہے۔

گلزار ابراھیم ۔ یہ تذکرہ ایسٹ انڈیا کے زمانے کا مشہور و معروف تاریخی و ادبی تذکرہ ہے۔ اس کے متعدد نسخے ہند و بیرون ہند کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ اس تذکرے میں تقریباً ۳۲۶ شعرا کے احوال اور کلام قلم بند کئے ہیں۔ پروفیسر سید حنیف نقوی کے مطابق تذکرہ گلزار ابراہیم کی پہلی اشاعت ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ گلشن ہند میں تمام شعرا کا ذکر نہیں ہے۔(۶) ۱۹۷۴ء میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے رسالہ ''معاصر'' کے دو شماروں میں مکمل طور پر لکھ کر شایع کیا۔ ان تمام شعرا کی شمولیت اردو شاعروں کی حیثیت سے کی گئی ہے۔

سید حنیف نقوی صاحب نے اپنی کتاب میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ مرزا علی لطف مترجم گلزار ابراہیم کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس تذکرے کی تسوید اور ترتیب کی مدت بارہ سال بتائی ہے۔ مگر انہوں نے دیباچہ گلزار ابراہیم کے حوالے سے ہی مرزا لطف علی کے بیان کی تردید کی ہے۔ دیباچہ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

بسال یك ہزار وہفت صد و ہشتادوچہار عیسوی ویك ہزار و یك صد نودوہشت ہجری از نویسد آن فراغ حاصل شد۔

پروفیسر سید حنیف نقوی صاحب نے اپنی اس تحقیق میں مختلف صاحبان علم وفضلا کے بیان بھی درج کئے ہیں جن میں فضل علی دانا، محمد عابد دل عظیم آبادی، اصالت خان ثابت، میر قدرت اللہ رخصت، قلندر بخش جرات، شاہ عالم آفتاب، رام داس مغموم کے بیانات شامل ہیں۔ بہر حال یہ ایک تحقیق کا موضوع ہے۔

گلزار ابراہیم سے قبل بھی کئی تذکرے اردو شعرا کے وجود میں آ چکے تھے علی ابراہیم خلیل نے اس تذکرے کی تالیف میں ان سے بھی استفادہ کیا ہوگا۔ اگرچہ علی ابراہیم نے اس ضمن میں کوئی ذکر نہیں کیا تاہم گمان کامل یہ ہے کہ اس تذکرے کے مواد کی فراہمی میں مختلف تذکروں سے استفادہ کرنا بعید از قیاس نہیں۔

گلزار ابراہیم کے تالیف کے وقت ہندوستان بالخصوص شمالی ہند دور خلفشار سے گزر رہا تھا عموماً اہل فن اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہے تھے نتیجتاً ہجرت اور قیام گاہ کی منتقلی عام ہو چکی تھی علی ابراہیم نے اپنے تذکروں مین ان تمام احوال کا ذکر کیا ہے۔ سیاسی خلفشار ہندوستان کی تہذیب وتمدن کے سلسلہ میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

تذکرہ صحف ابراھیم ۔ اس تذکرے کی تالیف کا آغاز علی ابراہیم خلیل نے ۱۲۰۵ھ میں کیا۔ علی ابراہیم خلیل کے دل میں صحف ابراہیم کا خیال تذکرہ خلاصۃ الکلام اور گلزار ابراہیم کی تالیف سے قبل پیدا ہو چکا تھا۔ مواد کی فراہمی بھی مسلسل جاری تھی مشاغل علمی اور امور مملکت میں مصروفیت کے سبب یہ خواہش اب تک پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی تھی مگر جب بنارس میں زندگی رفاہ و آرام سے بسر ہونے لگی تو ۱۲۰۵ھ میں تالیف کا کام شروع کیا۔ صحف ابراہیم کی تالیف وترتیب کے وقت موصوف کی عمر تقریباً ۷۰ سال ہو چکی تھی اس ضمن مین دیباچہ میں ایک رباعی بھی تحریر ہے۔

زتائید نقاش ہرزشت و زیبا　　　مگر این نقش نودرنکوئی یگانہ

چــوتـــاریــخ اتــمـــام جستــم زهـــاتف بــگــفتـــار بــگــو نــفــع بــخـــش زمـــانـــه

نفع بخش زمانہ سے تاریخ اتمام تذکرہ ۱۲۰۵ھ معلوم ہوتی ہے۔ امداد برہانپوری نے صحف ابراہیم کا سال تالیف ۱۱۹۰ھ تحریر کیا ہے اگر چہ تذکرہ نگاروں میں قدر اختلاف ہے کہ کسی نے ۱۱۹۰ھ تحریر کیا ہے اور کسی نے ۱۱۹۳ھ تو بعضوں نے ۱۱۹۷ھ، ۱۱۹۹ھ اور ۱۲۰۲ھ تحریر کیا ہے مگر ڈاکٹر سید علی رضا نقوی اپنی کتاب تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان میں رباعی مذکور کے حوالے سے ۱۲۰۵ھ تاریخ اتمام کو صحیح قرار دیا ہے اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔ تذکرہ مذکور کا آغاز ذیل کی عبارتوں سے ہوتا ہے۔

''بحمدوثنای حضرت باری سمت عزا سمه که معنی سرایان عیسی نفس را بمصداق ان الله حکماامسکہا عن الایمنا لیجربہا علی لسان الشعرا قدرت معجزبیانی عطا فرموده ونکته سرایان دقیقه درس را بمضمون الشعرا تلامیذالرحمن دری از دارالعلم غیب برروی استعداد گشود''۔ ۷

یہ تذکرہ تین ہزار دوسواٹھہتر (۳۲۷۸) شاعروں کے احوال واشعار پر حروف تہجی کے طور پر ترتیب دیا گیا ہے۔ جن میں شعرا وعرفا، سلاطین ووزرا کے احوال اور انکی خدمات نیز کلام بھی درج کئے ہیں۔ زبان وبیان کے لحاظ سے علی ابراہیم خلیل نے حسب موقع طرز تحریر استعمال کیا ہے۔ عبارت عموماً سادہ ہے لیکن کہیں کہیں پر بضرورت مسجع ومقفع عبارتیں اور محاورات بھی شامل ہیں۔

یہ تذکرہ چونکہ شعرا، علماوفضلا نیز سلاطین وامرا کے احوال پر مشتمل ہے لہذا اسکی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور اقتصادی اہمیت بھی مسلم ہے۔ بعض صاحبان علم وفن نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس دور کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک صحف ابراہیم کا مطالعہ نہ کیا جائے۔

مراجع و مصادر:۔

(۱) تذکرہ نویسی فارسی در ہندوپاکستان۔ ڈاکٹر سید علی رضا نقوی صفحہ ۴۵۷۔

(۲) صحف ابراہیم کے پیش گفتار ص ۳ پر درج عبارت سے انکے ماموں ہونے کی تصدیق ہوتی ہے ''زائـــر حسیـن خـــان زائــر عظیم آبادی خلف فاضل ملا محمد نصیر خالوی اوست''۔

(۳) صحف ابراہیم۔ علی ابراہیم خان خلیل ۔ (۴) چاپ خدابخش لائبریری پٹنہ۔

(۵) صحف ابراہیم، علی ابراہیم خلیل۔ صفحہ ۳۔ ۲ چاپ خدابخش لائبریری پٹنہ۔

(۶) شعرا اردو کے تذکرے، سید حنیف نقوی، صفحہ ۴۰۶۔

(۷) تذکرہ نویسی فارسی در ہندوپاکستان، ڈاکٹر سید علی رضا نقوی، صفحہ ۴۷۰۔

☆☆☆

غالب کے ایک معاصر امیر حسن خاں بسمل کاکوروی

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی، صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شمالی ہندوستان کے جو قصبات و بستیاں مردم خیزی میں مشہور رہی ہیں ان میں کاکوری ضلع لکھنؤ کو بہت سی جہات میں امتیاز حاصل رہا ہے یہاں کے باصلاحیت و بیدار مغز حضرات نے سلاطین اودھ اور سرکار انگریزی کے دماغوں وقلوب پر بڑی کامیابی سے فرماں روائی کی۔ انہوں نے رزم و بزم ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ نواب امیر حسن خاں علوی بسملؔ بن نواب امیر عاشق علی خاں سفیر شاہ اودھ (۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء) بن شیخ طفیل علی علوی فوجدار شاہی بن شیخ محم بن شیخ غلام نبی بن شیخ جار اللہ علوی ہفت ہزاری وتر خانی بن ملا عظمت اللہ کاکوروی (استاد شہزادی زیب النساء بیگم) مخدوم زادگان کاکوری کے ایک ممتاز فرد تھے (۱)۔ وہ تقریباً ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ کاکوری کے عام دستور کے مطابق مولانا شاہ حمایت علی قلندر کاکورویؒ (۱۲۲۶ھ/۱۸۱۲ء) سے خانقاہ کاظمیہ قلندریہ پر تسمیہ خوانی ہوئی اور ان سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اپنے والد کے پاس کلکتہ گئے اور درسیات کی تکمیل کی۔ ابتداء میں اس دور کے امیر زادوں اور رؤساء کی طرح تعلیم سے کچھ خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کے والد نے اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہ (۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) کے جانشین و خلف اکبر مولانا شاہ تراب علی قلندر قدس سرہ (۱۱۸۱ھ/۱۷۶۸ء۔ ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء) کی خدمت میں اس سلسلہ میں ایک خط لکھا اور یہ آنجناب قدس سرہ کی دعاؤں وتوجہ کی برکت سے فایق الاقران ہوئے (۲)۔ سلسلہ قادریہ قلندریہ میں شاہ تراب علی قلندر قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور پیر و مرشد کے بڑے مقبول ومنظور ہوئے۔ چنانچہ وہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”محب فقرا بر خوردار از ہر دو جہاں راحت دل و جاں امیر حسن خاں بہادر سلامت۔ از فقیر تراب علی بعد دعاہائے خیر دوجہانی و حصول ملاقات جسمانی۔۔۔۔۔ جزاك الله خيرا وا عطاك الله لباساً فاخراً فی الدنيا و الآخرة۔ محبت و نیاز شما زیادہ از پدر مرحوم ایشاں فی نماید۔ اللّٰہم زد فزد۔۔۔۔۔۔

ساغر مے در کفم نہ تا ز سر ۔۔۔ بر کشم ایں دلق ازرق فام را

غرض محبت آں نور چشم ناخن بدل می ۔۔۔ زثہ و آرزو مند دیدار می دارد کاش جلد میسر آید

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است ۔۔۔ تو بدیں آرزو مرا برساں (۳)

ان کے سلسلہ میں ان کے پیر و مرشد ان کے والد امیر عاشق علی خاں کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”یکبار شما نوشتہ بودید کہ ارادۂ دارم اگر برخوردار امیر حسن خاں اینجا بیاید ہمہ کار

حـوالـۂ او کـنـم و خـود بـرای چـندی بکانپور آیم چون کہ این مراد بر آمد حالا مناسب است بلکہ ضـرور کـہ بـرائـے چندی اینجا بیایند اگر زندہ باشم بملاقات یکدیگر مسرور شوم کہ دیدن ما و شما دریں وقت غنیمت است ایفای وعدہ ضرورست اکنوں ہمہ کاروبار آنجا بہ ذمہ برخوردار مذکور نـمـایـنـد و ہـر مـراتـب فـہـمـانیدہ خود فارغبال در یاد ایزد متعال اوقات بسر برند بالفعل برخوردار را تـعلیم وضعداری و ہوشیاری در امور دنیا داری کردن ست تا بہ صلاحیت و روش اسلاف گذارد و بـر نـمـاز و روزہ و طـریـقـۂ اہـل سـنـت و جماعت مستعد باشد کہ دریں زمانہ ایں قدر بس ست کہ مسـرف و فـضول نہ باشد و بر آئین شما قدم نہد کہ دستور العمل شما خوب ست۔ بالفعل ازو توقع مـذاق تـصـوف ندارند کہ ہنوز کم سن ست و از بچگئ پروردۂ دولت و عادی صحبت اہل دولت سـت۔ دفعتـہ چـگونہ تارک متنفر خواہد شد رفتہ رفتہ اگر خواستہ خداست وی نیز ہمچو شما در صحبت شما خواہد شد(۴)۔‘‘

امیر حسن خاں فارسی وعربی اوراردو میں بڑی اچھی لیاقت رکھتے تھے اوراپنے عہد کے قادرالکلام شاعراورشاعری ونثر نگاری میں سرآمد سخن سنجان روزگار سمجھے جاتے تھے۔فارسی شاعری میں شیخ غلام بینا علوی ساحؔر کاکوروی (م ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء) (غلام ہمدانی مصحفؔی کے شاگردرشید جن کے بارے میں مرزاقتیؔل نے لکھا ہے کہ ’’او شاگرد مصحفیؔ نیست بل اوستاد اوست‘‘) سے تلمذ تھا۔امیر حسن خاں بسمؔل سے غالب کی ایک بارشاعرانہ چشمک بھی ہوئی۔انہوں نے شاعرانہ تعلّی میں ایک شعر کہا:

جملہ زاغ اند شاعران جہاں　　　لیک یك طوطی شکر خامن(۵)

مرزاغالبؔ ان دنوں کلکتہ میں تھے شدہ شدہ یہ شعران تک جاپہنچا انہوں نے جواب میں کہا:

لاجرم بی سزد کہ نکتہ دراں　　　نام بسملؔ نہند ہیرامن(۶)

ان کے مزاج کوسخت نا گوار ہوااور شکر رنجی ہوگئی۔غالبؔ بڑے اداشناس تھے منت وساجت سے صلح صفائی کرائی۔معافی نامہ لکھااور خودبھی معذرت خواہ ہوئے چنانچہ پنج گنج میں دو رقعے ان کے نام اورایک رقعہ مظفرحسین خاں کے نام سفارشی اس کے شاہد ہیں۔ مظفرحسین خاں کے نام لکھتے ہیں:

’’بـاری چـوں بـہ کـلـکتـہ رسیـدہ انـد چـوں خوش باشد کہ دلنوازی و کارسازی را اساسی استـوار نـہـنـد و الاابـالـی خرام عرصہ سخنوری۔ یوسف کنعان بمعنی گستری شیوا زبان روشن دل مـکرمی امیر حسن خاں بسملؔ را با من آشتی دہند۔ زنگار آئینہ گراں نشیں نیست کہ کف بزددن تـواں سود و خوشدلی درمیان ہم روی نہ تواند۔ یزداں داند کہ آں گفتار کہ ازاں سو بہ بیہدہ لافی و

ازین سو در تلافی آمد نه پسندیده ام۔ مہر و وفائی من با منشی عاشق علی خاں مغفور آن میخواہد که تا امیر حسن خاں را از جاں دوست تر ندارم خود را از حق گذاران نه شمارم:

بداں معامله او بی دماغ و من بیدل	خوشا که معذرتی صرف بر ستم گردد (۷)

اسی کے ساتھ بسمؔل کے نام اپنے مکتوب کی ابتداء اس شعر سے کی:

داغم ز سوز غم که خجل داردم ز خلق	بوی که تن ز سوختن استخواں دہد

علاوہ ازیں غالبؔ نے یہ دو رباعیاں بھی تلافی مافات میں لکھیں:

بسمل که سخن تراز ہر آئین است	ارزش ده آن و مایه بخش این ست
او بادشه ہست گر سخن اقلیم ست	او پیش روست گر محبت دین ست (۸)
گر پرورش مہر نه زاں دل بودی	در دہر شیوع مہر مشکل بودی
در صدق ز جملۂ رسائل بودی	بسم اللہ آں رساله بسمل بودی

بالآخر جب صلح صفائی ہوگئی تو بسمؔل نے بھی غالبؔ کی خوش دلی کے واسطے لکھا:

زاں که در فن بلاغت غالبؔ استاد آمده	غالب و اغلب یکی در حرف و اعداد آمده

ایک مکتوب کے عنوان پر یہ شعر لکھا:

اے شمع شرح داغ مپرس از دلم خموش	سوزد کسی که گوش بر این داستان دہد

بسمؔل فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے مگر اردو میں دو ایک قطعات و رباعیات کے علاوہ موجود نہیں ان کے فارسی دیوان (غیر مطبوعہ) میں طویل و مختصر غزلیں ہیں جن میں تمام شاعرانہ محاسن موجود ہیں۔ بعض غزلیں ۲۰۔۱۲۵ اشعار پر مشتمل ہیں۔ غیر منقوطہ قصائد بھی ہیں۔ علاوہ ازیں حافظ شیرازی، سعدی، خسرو، عرفی، نظیری، کشفی، علی حزیں اور شوکت وغیرہ کی غزلوں پر مخمس ہیں اور اساتذہ و پیش رووں کے مصرعوں پر تضمینیں اور گرہیں ہیں انہوں نے اپنے تخلص سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ فن تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا:

گوید دم نزع بسمؔل زار	جاں می کند این چه پیشه دارد
رقص بسمؔل نه نشاط است که بر گردن او	تیغ راندی و نگفتن که سزاوار نبود
بسمؔل از حرکت من مثل ذبیحاں چه کنم	می کند خنده دہن ریز و نمایاں زنجیر
آں چشم نیم باز است و باز نیست	در خواب ناز جلوۂ ناز است و ناز نیست
ز عنقا پیشتر یك گام ما رفت	که نام او نه رفت و نام ما رفت
آہی زدیم برق شد و بر سما رسید	این دود دل نگه ز کجا تا کجا رسید

از وعده ہای بوسہ کہ دادی بلب مرا جان حزیں چو نالہ رسید و بجا رسید
ہر غنچہ خندہ زن بسر شاخ رقص کرد از کوی او چو دست فشار آن صبا رسید
ہمدم بہ لبت جام و می ہوش رباہم ما مست ادای تو لبی بر لب ما ہم
طبع شعراء از رقمم دست فشاں شد در پنجۂ بسملؔ قلم غالیہ ساہم

تضمین بر غزل شیخ علی حزیںؔ:

عمریست کہ چوں بسمل دلخستہ و شیدا حیرانم و کس نیست کہ ایں عقدہ کند را
سنگین دل و بد کیش و ستم پیشہ سراپا در بتکدۂ دل صنمی ہست حزیں را

تا کعبہ کراخانہ خدا داشتہ باشد

بسملؔ شدیم مست حزیں چوں بکعبہ گفت پیمانہ را بگوشۂ محراب می زدم
فغانی را چو عیسیٰ میدہم از نکتہ جاں بسملؔ اگر من در عجم از ہند چوں روح از بدن رفتم
بسملؔ چو صہبائی کجا بینم سخن سنجی دگر چشمی و چندیں نسخہ خواب پریشاں در بغل
از دل لخت لخت ما پیش عنا دل ای صبا صد گل تر برار مغاں تازہ بتازہ نو بنو

انہوں نے سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ کی شان میں بھی دو طویل مدحیہ قصیدے غیر منقوطہ لکھے علاوہ ازیں نواب معین الدولہ، امجد علی شاہ، وغیرہ کی شان میں بھی غیر منقوطہ قصائد ہیں:

للہ الحمد کہ سر کردۂ حکام آمد مالک ملک کرم داور اسلام آمد
سرور عادل و اکرم کہ در او در دہر مطلع مہر عطا و مہ اکرام آمد
ہمہ عدل و ہمہ اعطا ہمہ مہر و ہمہ رحم کہ ہواء در او حاصل ہر کام آمد

تاریخ جلوس وزارت امین الدولہ امداد حسین خاں بہادر

شنو کز دور می گویم دعا در پردۂ تاریخ کہ آں زیبا وزارت دائما و کر و فر بادا(۱۲۵۸ھ)

بسلسلۂ شہادت شاہ شجاع الملک ابدالی

آخرش سال شہادت خامۂ بسملؔ نوشت ہای شد ناگہ شجاع الملک ابدالی شہید (۱۲۵۸ھ)

ممنونؔ دہلوی کی تاریخ وفات یہ کہی:

ز نیرنگ قضا کردم عجب تاریخ او گفتم
چو شد از مردن ممنوں جناں ممنون جہاں محزوں (۱۲۶۰ھ)

ایک شاعر جن کا تخلص شعلہؔ، کی تاریخ وفات کہی:

دامان حیات شعلہؔ بر چید	دی شب چو ز خاکدان فانی
تاریخ نوشت کلك بسملؔ	شب گل شده وای شمع معنی (۱۲۵۸ھ)

ان کے والد ماجد نواب امیر عاشق علی خاں سفیر شاہ اودھ کی وفات ۱۲۵٦ھ میں ہوئی۔قطعہ تاریخ کا شعر ملاحظہ ہو:

اگر پرسند سال انتقالش	بحسرت گو کجا عاشق علی خاں(۱۲۵٦ھ) (۹)

انہوں نے مرزا غالب کی پنج آہنگ کے طرز اور جواب میں ۱۲٦۰ھ میں ''پنج گلبن''، لکھی اس میں بعض ایسے مکاتیب بھی ہیں جن کے ہر فقرہ سے سال تحریر ۱۲٦۰ھ برآمد ہوتا ہے(۱۰)۔بسملؔ کی نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

'' سیاہ سناں سر بکنارہم ہم کشیدہ الفاظ کہ در پیمانۂ از صفحات از ساغر دو ابر بادہ آشام معنی رنگیں افتادہ تر زبان ز لال حمد بیش از قیاس قدیری بودہ اند عظمت آلادہ کہ داغ لالہ پیکانی را بہ یمن تشبیہ کامل با داغ دل در خوں خوابیدہ خدنگ عشقش بر تابندہ سریر لعل شب چراغ جلوس شہنشاہانہ میسر است و صبوحی زدگاں در بر یکدیگر غلطیدہ فقرات کہ از ہر عدی و مرکزی حرکت ابروی اشارتی بتماشای خط ساغر نکات ہوش از سر پرواز دادہ ترانہ محمدت محمودی سرودہ اند۔۔۔۔ ''

اپنے رسالہ ''میزان المعانی'' کی ابتداء میں رقم طراز ہیں:

''اما بعد بسمل ہیچ ہیچ میسر ز گوید کہ این ذخیرہ ایست موجز و نافع موسوم بہ میزان المعانی در بیان اقسام سرقات شعری مستنبط از کلام اسلاف علت تحریر ش اینکہ درین جز درماں کہ کشاد بازار سخن را کمال است۔۔۔۔۔۔(۱۱)''

بسملؔ کی علمی وادبی یادگار میں منشآت سبحان علی خاں پر ایک طویل نثری تقریظ بھی ہے جو ان کی فارسی نثاری کا اعلیٰ نمونہ ہے اس کے اختتام پر تحریر فرماتے ہیں:

لوحش اللہ چہ کتابیست کہ از ہر لفظش	جلوہ بردار نظر صفحہ ارزنگ آمد
بوئے معنی ز گل لفظ فصیح ست بلند	چوں نوائے کہ ز مرغان خوش آہنگ آمد
شاہد فقرہ شوخش بادائے نمکیں	مشك پاش دل چاك از خط شبرنگ آمد

امید کہ نا گردش چشم روزگار بو قلمون بسواد و بیاض است و روز از دورنگی چرخ نیرنگ طراز اشارت فرماہست این مجلد زیبا نگار سرمہ فروش مردم عالی نظر و از ورق گردانی لیل و نہار

چوں گل آفتاب از سموم و صر صر بیخطر باد(۱۲)۔''

بسملؔ کاکوروی نے تقریباً ۴۷ سال کی عمر میں ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۶۳ھ مطابق ۸ ستمبر ۱۸۴۷ء کو کلکتہ میں وفات پائی اور سیالدہ اسٹیشن کے قریب چوبیس پرگنہ کے قبرستان میں دفن ہوئے (۱۳)۔

''الفیض الجاری تتمہ کشف المتواری فی حال نظام الدین القاری'' کے مولف نے لکھا ہے ''راقم نے ان کی عکسی تصویر بھی ان کے نواسوں کے پاس دیکھی ہے۔ درباری لباس پہنے ہیں، دونوں طرف کا کلیں چھوٹی ہوئی ہیں، گلے میں مالائے مروارید ڈالے ہیں اگلے زمانے کے شرفاء کی وضع ہے اور چہرے سے لیاقت ومتانت، شوخی اور ذہانت ٹپکتی ہے (۱۴)۔''

ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹے رضا حسن خاں علوی ہوئے ایک بیٹی کا نکاح ہادی حسن خاں علوی محوؔر کاکوروی سے ہوا وہ لا ولد فوت ہوئیں اور دوسری بیٹی کا عقد علی نقی خاں علوی کاکوروی سے ہوا ان کی اولاد موجود ہے۔

رضا حسن خاں علوی (۱۳ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ/۲۷ اپریل ۱۸۳۱ء۔ ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۶۶ھ/۴ مارچ ۱۸۵۰ء دوشنبہ وقت مغرب) اپنے والد ماجد سے زیادہ لایق وفایق اور غیر معمولی تھے۔ مختصر سی عمر میں عربی کتب ورسائل کی ایک بڑی تعداد (تقریباً ۲۰ عدد) اور اپنے تمام پیش روؤں سے زیادہ طویل عربی لامیہ ودالیہ قصائد اپنے پیچھے چھوڑ کر کلکتہ میں بے نام ونشان مالک حقیقی سے جا ملے، اپنی وفات سے پیشتر انہوں نے ایک موثر وصیت نامہ بھی عربی زبان میں لکھا تھا (۱۵)۔

مصادر و مراجع:۔

(۱) تذکرہ مشاہیر کاکوری۔ مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر کاکوروی ص ۵۱، ۲۳۰، اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء،

(۲) مطالب رشیدی۔ مولانا شاہ تراب علی قلندر کاکوروی، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۸ء،

(۳) تذکرہ مشاہیر کاکوری، مصدر سابق،　　(۴) مطالب رشیدی، ص ۲۱۹،

(۵) تذکرہ صبح گلشن۔ نواب علی حسن خاں سلیمؔ،　　(۶) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۵۲،

(۷) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۵۲،　　(۸) کلیات غالبؔ، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۲ء ص ۵۴۴،

(۹) دیوان امیر حسن خاں بسملؔ مخزونہ کتب خانہ انوریہ کاکوری ضلع کاکوری،

(۱۰) پنج گلبن۔ بسمل کاکوروی۔ کتب خانہ انوریہ،　　(۱۱) میزان المعانی، بسملؔ کاکوروی، کتب خانہ انوریہ،

(۱۲) میزان المعانی،　　(۱۳) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۵۴،

(۱۴) الفیض الجاری، منشی عبدالعلی کاکوروی، شام اودھ پریس لکھنؤ، ۱۹۰۱ء ص ۹۷۔۹۶،

(۱۵) کواکب، مسعود انور علوی، ص ۱۹۶۔۱۷۷۔

☆☆☆

مولانا روم اور ان کے کلام سے متعلق تاریخ گوئی

پروفیسر عراق رضا زیدی، صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

فارسی ادب کا ارتقاء اسلام کی روشنی کے پس منظر میں نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ قبل از اسلام کے فارسی ادب کا مفقود ہونا بھی ہوسکتا ہے۔ ایران میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ عربی زبان کے اثرات بھی نمایاں ہوئے۔ لیکن عربی النسل حکمرانوں کے دور تک فارسی زبان کی طرف کسی نے نظر التفات نہ کی۔ مامون رشید کو بادشاہ بنانے میں ایرانیوں نے اہم رول ادا کیا، خصوصاً طاہر ذوالیمینین کی حکمت عملی اور سپہ سالاری میں ایک قلیل فوج نے عرب کی کثیر فوج پر فتح حاصل کی جس کے نتیجے میں ''طاہریہ'' خاندان کی امارت مسلم ہوئی۔ یہیں سے فارسی زبان کا ارتقائی سفر شروع ہوا۔ ابھی تک عربی زبان کا دور دورہ تھا۔ اب جبکہ فارسی زبان نے پاؤں پھیلانا شروع کئے تو اس کے سامنے سوائے عربی زبان کے اتباع کے کوئی چارہ نہ تھا۔ گویا زبان اور اس کے الفاظ ایرانی تھے لیکن تخیل اور مضامین پر عربی کے گہرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ اصناف سخن میں قصیدہ 'غزل' قطعہ، ترجیع بند، مرثیہ وغیرہ کی فارسی میں وہی ہیئت قائم ہوئی جو عربی زبان وادب میں مستعمل تھی۔ عرب حکمرانوں سے نجات اور عربی زبان سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ایرانی دانشوروں میں غیر شعوری طور پر یہ احساس بیدار ہونے لگا کہ عربی زبان کی اصناف سخن اور الفاظ سے نجات کی بھی کوئی صورت نکالی جانی چاہئے۔ سچ تو یہ ہے کہ صدیوں کی روایت ختم کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک اسلامی افکار، خود مسلمانوں کی آسمانی کتاب، درس زندگی کی شکل میں ''قرآن شریف، بھی عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔ لہٰذا اس زبان سے محبت، لگاؤ اور اس کا سیکھنا سکھانا دینی ضرورت بھی تھا۔ حدیث، فقہ وادبیات کا تمام ذخیرہ اسی عربی زبان میں موجود تھا لہٰذا اس لسانی آزادی میں وہ زور وشدت پیدا نہ ہوسکی جو قومی ووطنی آزادی کے لئے کارگر ثابت ہوئی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ عربی زبان کے الفاظ کا استعمال کم ہونے لگا اور اصناف سخن میں بھی فارسی نے اپنی تین اصناف ایجاد کیں جو عربی میں موجود نہ تھیں۔ لیکن ان میں سے دو اصناف کے نام عربی زبان کے تھے تو تیسری صنف عربی لفظ سے مرکب تھی۔ یہ اصناف تھیں رباعی، مثنوی اور تاریخ گوئی۔ فارسی شعرا نے ان تینوں اصناف پر بھرپور محنت کی جس کے نتیجے میں اس زبان کی تمام دنیا میں شہرت کا سہرا بھی انھیں اصناف کے سر رہا۔ گوکہ فارسی کی مقبول ترین صنف ''غزل'' ہی ہے جس نے اردو کے پیکر میں نامساعد حالات میں بھی اردو کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن فارسی زبان کی پہچان مثنوی اور رباعی کے ذریعے ہی تمام عالم میں ہوئی ہے۔

فارسی کے مثنویاتی شاہکاروں میں شاہنامہ فردوسی، اور مثنوی معنوی نے دنیا کی ہر زبان کے ادب اور ہر مذہب وملت کے انسانوں کو متاثر کیا ہے۔ ان میں بھی مثنوی مولانا روم مثنوی معنوی نے دو قدم آگے بڑھا کر انسانی برادری کو سکون وراحت کے راستے دکھائے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں جب کہ مشینوں کے ساتھ کام کرتے کرتے خود بھی انسان مشین کی طرح کام کرنے والا بن چکا ہے۔ اس کے پاس خود اپنے سکون کے لئے دو پل بھی نہیں۔ مال وزر کے لالچ نے انسانی اقدار کو اتنا زوال پذیر کر دیا ہے کہ امریکہ جیسے ترقی

یافتہ ملک میں اس ''ذلالت'' کا سروے ہو رہا ہے کہ کنواری یا بلوغت کی منزل پر قدم رکھ چکی دوشیزاؤں میں ماں بننے کا رجحان کتنے فی صد کم یا زیادہ ہو چکا ہے۔ گویا کتنی فیصد عورتیں کنواری مائیں بن جاتی ہیں۔ چنانچہ ۷/دسمبر ۲۰۰۹ء کے راشٹریہ سہارا میں آئینہ عالم سے منسوب آخری صفحہ کی ایک خبر کا عنوان ہی ''امریکہ میں غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد میں اضافہ'' ہے اس مقالے میں تہذیبی گراوٹ پر اس سے زیادہ لکھنا غیر مناسب سا لگتا ہے۔ لیکن اس ایک عنوان سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ انسانی اقدار گر رہے ہیں تو حیوانی افعال بڑھ رہے ہیں۔ اور یہ سب کام ترقی کے نام پر انجام دئے جا رہے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں اس گندگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام سے ہی لوگوں کو بیزار کرنے کی سازشیں رچی جا رہی ہیں۔ ان تمام سازشوں کے باوجود اسلام کی مضبوط روایت اور کشش عوام کو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پر تنقید کرنے والے قرآنی افکار سے مرصع ''مثنوی معنوی'' کے افکار سے مانوس ہو رہے ہیں گو کہ یہ ہاتھ گھما کر کان پکڑنے والی بات ہے۔ انسانی بیداری اور اس کی روح کو سکون دینے والی ''لے'' مثنوی معنوی کی ''نی'' میں پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونسکو نے ۲۰۰۷ کو مولانا روم سے منسوب کیا اور ان کا پیغام ہر جگہ عام کیا گیا۔ مثنوی معنوی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے فارسی کی اپنی ایجاد کردہ صنف سخن ''مثنوی'' میں ہے۔ تاریخ گوئی بھی فارسی کی اپنی ایجاد کردہ صنف سخن ہے۔ جو عربی کے حروفی نظام 'ابجد' یا فن ''جمل'' پر مبنی ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس صنف کا وجود مثنوی اور رباعی کی طرح مفقود ہے۔ فارسی کی اصناف ''رباعی'' اور تاریخ گوئی دونوں ہی دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں مشکل اصناف ہیں۔ رباعی اپنے مضامین اور خصوصاً ایک ہی بحر اور اس میں رائج ۲۴ اوزان کی بنا پر، تو تاریخ گوئی علم ریاضی سے وابستہ ہونے کی بنا پر۔ ایک ایک حرف کے نمبر شمار کر کے جوڑنا پھر اسے کسی وزن میں موزوں کرنا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن فارسی کے تاریخ گو شعرا نے اس مشکل صنف کو اسی طرح اپنایا ہے جس طرح رباعی یا مثنوی کو۔ یہی نہیں اس صنف نے غزل، قصیدہ، مرثیہ جیسے اصناف کو بھی متاثر کیا ہے۔ مثنوی کی طرح تاریخ گوئی بھی ابوشکور بلخی کے دور میں ہی اسی کی مثنوی ''آفرین نامہ'' میں نظر آتی ہے۔

؎ مر این داستان کش بگفت از نیال ابر سی صدو سی و سہ بود سال

یہ صوری تاریخ ہے جو ''آفرین نامہ'' کا ۳۳۳ھ میں لکھا جانا بتاتی ہے۔ تاریخ گوئی کی یہی ابتدا آہستہ آہستہ ترقی کے مراحل طے کرتی ہوئی صوری کے ساتھ معنوی تاریخ گوئی میں داد تحسین حاصل کرتی ہوئی تدخلہ، تخرجہ کی منزل میں داخل ہو کر شاعری سے متعلق تمام حسن وخوبیوں سے مرصع ہونے کے علاوہ، علم بیان، صنایع بدایع اور اسی طرح کے کچھ دوسری خوبیوں سے پر لوازمات کے ساتھ پہلی بار حافظ کے دیوان کی باقاعدہ زینت بن کر قصیدہ سے زیادہ انعام واکرام کی طالب ہوتی ہے۔ تاریخ گوئی سے متعلق تمام معلومات راقم کی کتاب ''فارسی میں تاریخ گوئی کی راویت'' سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ صنف تاریخ گوئی کا مکمل عہد شباب ایران میں صفوی اور ہندوستان میں مغلیہ دور میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں بات بات پر تاریخ موزوں کرنے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں فن تاریخ گوئی کی اہمیت اور روایت کو مستحکم کرنے میں درباروں کے علاوہ مطبع اور پریسوں کا بھی اہم کردار رہا ہے جنھوں نے ہر کتاب کی اشاعت پر اس سے متعلق

تاریخی قطعات موزوں کرا کر کتاب کے آخر یا شروع میں دستاویز کی شکل میں شائع کئے ہیں۔ مولانا روم کے عہد تک معنوی تاریخ کے مکمل خدوخال نمایاں نہیں ہو سکے تھے۔ البتہ ۵۵۱ھ میں خاقانی نے اپنے ایک قصیدے میں حروف کے جداگانہ اعداد ضرور شمار کر لئے تھے۔

؎ در سنه ثاء، نون، الف به حضرت موصل　　راندم ثا، نون، الف سزای صفاہان

اس طرح سعدی کی تاریخ وفات ۶۹۱ء خ، ص اور الف سے موزوں کی گئی تھی جسے بعد میں لفظ ''خاص'' سے ظاہر کیا گیا۔ مولانا روم کی وفات انھیں دونوں سنوں کے درمیان ۶۷۲ھ میں ہوتی ہے۔ مولانا نے اپنی زندگی کے آخری دہوں میں مثنوی معنوی کو موزوں کیا تھا۔ اس مثنوی کے چھ دفتروں میں سے صرف دوسرے دفتر میں تاریخ گوئی کا حوالہ نظر آتا ہے۔ باقی پانچ دفتروں میں کوئی اشارہ نہیں ملتا، اس کی بھی ایک وجہ مولانا نے دوسرے دفتر کو کافی تاخیر سے موزوں کرنا بتایا ہے۔

؎ چون زدریا سوی ساحل باز گشت　　چنگ شعر مثنوی با ساز گشت
مطلع تاریخ این سودا و سود　　سال ہجرت ششصد و شصت و دو بود

مندرجہ بالا شعر کی روشنی میں دفتر دوم کا آغاز چھ سو باسٹھ ہجری میں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس شعر سے یہ معلومات بھی فراہم ہو جاتی ہے کہ مولانا اس وقت کے تاریخ گوئی کے صوری نظام سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس شعر کا اردو ترجمہ مولوی فیروز الدین کی مرتبہ ''الہام منظوم'' ترجمہ اردو مثنوی مولانا روم دفتر دوم ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں اس طرح ملتا ہے۔

؎ مطلع تاریخ اس ترتیب کا　　چھ سو باسٹھ سال ہجری ہو گیا۔

مولانا کی وفات ۶۷۲ھ میں ہوئی جن کا قطعہ تاریخ وفات ایک مدت کے بعد علمی نظمی نے موزوں کیا۔ جسے ''دویست سخنور تذکرہ منظوم و منثور'' میں مندرجہ ذیل عنوان کے تحت شائع کیا گیا۔

تاریخ وفات مولوی بلخی

بس دلاویز است نای مولوی　　نغمہ گوش آشنای مولوی
در سرش پنہان چہ شوری بودہ است　　کس نداند، جز خدای مولوی
ہیچکس را عشق ارزانی نداشت　　دولت بی منتہای مولوی
مثنوی را گر نسنجد سالہا　　کس نداند مدعای مولوی
'شمس' را نازم کہ در سیر و سلوک　　بود پیرو رہنمای مولوی
سال فوتش را اگر جوید کسی　　گو" (دلاویز است نای مولوی "

۶۷۲ھ

مندرجہ بالا قطعہ تاریخ کے آخری مصرع میں گو یعنی کہہ دو کے اعلان کے بعد ''دلاویز است نای مولوی'' سے ۶۷۲ عدد حاصل

ہوتے ہیں جو سال وفات مولانا روم ہے۔ اس صنعت معنوی سے مسجع مصرع میں ''نای'' کو مرکزیت عطا کی گئی ہے۔ یہ وہی ''نی'' ہے جو مثنوی معنوی کی تمہید یا پیش خیمہ ہے اور استعارے کی شکل میں مولانا کی روح کی طرح تڑپتی رہتی ہے جسے اس تڑپ نے ایسا دلاویز بنایا کہ مولانا اپنی اصل کی طرف یہ کہتے ہوئے واپس ہو گئے :

؎ ہر کسی کہ دو ماند از اصل خویش　　باز جوید روز گار وصل خویش

اور مولانا اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر کے وصل اصل سے مشرف ہو گئے۔ یہ معنوی تاریخ کے جوہر تھے تو صوری میں مولانا کی وفات کی تاریخ اس طرح موزوں کی گئی۔

؎ چون جلال الدین وصل اصل یافت　　ششصد و ہفتاد و دو رومی شتافت

گویا جب مولانا جلال الدین رومی نے اصل سے وصل پالیا تو وہ چھ سو بہتر ہجری میں روشن ہو گئے اس طرح اندھیری دنیا سے اجالے کی دنیا (عقبیٰ) کی طرف پلٹ گئے۔

ہندوستان میں تاریخ گوئی کا رواج ایران سے کچھ زیادہ ہی پھلا پھولا۔ جس کی واضح مثال ایرانی کتابوں کی اشاعت پر تاریخی قطعات کا مفقود ہونا ہے۔ جب کہ ہندوستان میں شائع ہونے والی کتابوں میں فن تاریخ گوئی کی عروج کی داستان مرقش نظر آتی ہے۔ یوں بھی ہندوستان میں ۱۴ ویں صدی عیسوی تک ایران سے زیادہ فارسی کتابیں شائع ہونے کا رواج رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہنامہ فردوسی کی بھی پہلی بار اشاعت ہندوستان میں ہی ہوئی تھی۔ مثنوی مولانا روم کے بھی کتنے ہی ایڈیشن ہندوستان میں شائع ہوئے ہیں۔ صرف اصل مثنوی کے ایڈیشن ہی کیا نہ جانے کتنے ترجمے اور شرحیں بھی اس مثنوی کی اردو نظم اور نثر میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے اکثر پر قطعات تاریخ اشاعت تحریر کئے گئے ہیں، اس مختصر مقالے میں ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ مثنوی معنوی کا ایک ایڈیشن محمد عبدالحمید کے زیر اہتمام در مطبع مجیدی واقع کانپور میں الگ الگ دفتروں کی شکل میں شائع کیا گیا۔ جس سلسلے کا پہلا دفتر ۱۲۰۳ھ میں ''دفتر اول مثنوی شریف'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس پر عربی کا مندرجہ ذیل شعر درج ہے۔

؎ قدتم الدفتر الثالث من الکتاب　　المثنوی المعنوی للمولوی المعنوی (۱۲۰۳ ھ)

مصرع ثانی سے ۱۲۰۳ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ پھر یہی مثنوی ۱۲۰۷ھ میں ''در مطبع نامی واقع کانپور مطبوع گردید'' کی عبارت کے ساتھ آخری صفحہ پر مندرجہ بالا شعر کے ساتھ ہی جو اس کتاب کے آخری صفحہ پر درج ہے شائع ہوئی جس پر تاریخ کا کوئی مصرع موزوں نہیں ملتا۔ لیکن ۱۸۶۵ء میں یہی مثنوی معنوی جب نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع کی گئی تو اس پر طباعت کی تاریخ اس طرح موزوں کی گئی۔

؎ طبع شد چو خاتمہ موجد صفا نہاد　　گفت سال عیسوی ''خاتمہ بخیر باد''(۱۸۶۵ء)

دوسرے مصرع کے آخری جز ''خاتمہ بخیر باد'' سے ۱۸۶۵ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ جس کے لئے اس مصرع میں گفت سال

عیسوی'' سے اشارہ بھی ملتا ہے۔ گویا اس مثنوی کی طباعت کا مرحلہ بخیر وخوبی سرہو گیا۔

مثنوی معنوی کا ایک اور ایڈیشن ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں نول کشور پریس سے شائع ہوا جس کے سرورق پر مندرجہ ذیل عبارت منقش ہے۔ سرورق کو چاروں طرف سے ایک بیل کی شکل میں پھولوں سے سجایا گیا ہے۔ پھر درمیان میں چاروں طرف حاشیہ بنا کر سب سے اوپر عربی میں کلام پاک کی ایک آیت

الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون

لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک اور خانہ بنا کر اس میں

''یعون اللّٰہ العالم الوحید کتاب مستطاب مثبت توحید مصداق این تبجیل''

تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک اور تیسرا خانہ بنا کر اس کے دو حصے کر کے درمیان میں جگہ چھوڑ کر دونوں حصوں میں ایک مصرعہ اس طرح تحریر کیا گیا ہے۔

گر زسر معرفت آگه شوی　　　　لفظ بگذاری سوِ معنی روی

پھر ایک چوتھا خانہ بنا کر اس کے دونوں جانب جگہ چھوڑ کر بیچ میں مندرجہ ذیل مصرع تحریر ہے۔

ے از نی کلك این حکایت بشنوی

بعدۂ ایک بڑے خانے میں جلی حروف سے ''مثنوی مولوی معنوی'' تحریر ہے۔

جس کے نیچے ایک پتلہ سا خانہ بنا کر اس کے بیچوں بیچ نہایت مختصر (دفتر اول) لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر ایک خانہ بنا کر اس کے درمیان میں مصرعہ **هست قرآن در زبان پهلوی**'' درج ہے۔

پھر ایک اور خانہ بنا کر جامی کا دوسرا شعر درمیان میں مختصر جگہ چھوڑ کر دونوں طرف لکھا گیا ہے۔

ے من چه گویم وصف آن عالیجناب　　　　نیست پیغمبر ولی دارد کتاب

اسی شعر کے نیچے۔ ''از تصنیفات حضرت محی الدین مخدومی مولانا جلال الدین رومی سزاوار چنین تفصیل'' درج ہے۔ آخری خانے میں پھر خاصے جلی حروف میں ''در مطبع منشی نول کشور واقع لکھنؤ حلیہ طبع پوشید'' تحریر ہے اسی طباعت کے آخری صفحات نمبر ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸ اور ۱۴۹ پر جداگانہ شعرا کے قطعات تاریخ طباعت مثنوی تحریر کئے گئے ہیں۔ پہلا قطعہ منشی شرف علی کا ہے جسے مندرجہ ذیل عنوان سے نوازا گیا ہے۔

قطعہ تاریخ مطبوعہ سابقہ نتیجۂ فکر خوش نویس عدیم المثال شاعر معجز مقال صاحب خیالات الطف منشی اشرف علی اشرف رحمہ اللہ۔

ے کلام مولوی روم شد طبع　　　　که هست آن مظهر اسرار کونین
برای سال طبعش کلك اشرف　　　　نوشته ''دفتر اسرار کونین''
۱۲۸۲　ھ

آخری مصرعہ میں نوشتہ یعنی لکھ دیا کیا لکھ دیا؟ ''دفتر اسرار کونین'' یہ جملہ مثنوی معنوی کی مکمل معرفت بھی ہے کہ یہ مثنوی کیا ہے؟ کائنات کے رازوں کا دفتر ہے۔ اتنے مختصر الفاظ میں اس مثنوی کی وضاحت اس سے بہتر ہونا مشکل ہے۔ پھر سونے پر سہاگا یہ کہ انھیں تین الفاظ سے ۱۲۸۲ھ تاریخ بھی موزوں ہو جاتی ہے۔ اور وہ بھی صنعت معنوی سالم میں۔

دوسرا قطعہ تاریخ طباعت مندرجہ ذیل شایان' صاحب کا ہے۔

''ایضاً طبعزاد شاعر شیوہ زبان طوطی گلزار ہندوستان منشی طوطا رام مرحوم متخلص بشایان

حبذا عرفان مولانای رومی باخدا
حق نما و حق پرست و حق شناس و پیشوا
در لباس نظم شیرین فی الحقیقت زدرقم
رمز قرآن و حدیث آن رہنمای بیش و کم
این کلام کامل و خضر طریق کا ملان
طبع شد در مطبع منشی عالی دودمان
بہر سالش زد رقم شایان چنین مصراع تر
'مثنوی مولوی معنوی راہبر'(۱۲۸۲ ھ)

انیسویں صدی کے ہندوستان میں مرزا غالب کے عزیز شاگرد ہرگوپال تفتہ تنہا ایسے شاعر ہیں جنھوں نے صرف فارسی میں شاعری کی ہے ورنہ اس دور کے سبھی شاعروں نے اردو کے ساتھ فارسی میں شعر کہے ہیں۔ تفتہ نے غزل کے پانچ دیوان چھوڑے ہیں۔ وہ فن تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مندرجہ بالا مثنوی کی اشاعت پر موصوف نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ ۲۴۶اص پر ان کا موزوں کیا ہوا قطعہ تاریخ اس طرح درج ہے

''ایضا'' نتیجہ فکر شاعر پختہ کلام اوج سخن را ماہ دو ہفتہ منشی ہر گوپال متخلص بہ تفتہ تلمیذ رشید مولانا غالب ؒ ''

طبع شد آن نسخہ کو راہنما شد مرا
دیدن آن شد دگر کام روای دلم
آئینہ از فیض او شد ہمہ تن گوئیا
دید توان این زمان صدق و صفای دلم
از سبب آن کہ شد این ہمہ دولت نصیب
در حق او ہر زمان باد و دعای دلم
الغرضش سال طبع تفتہ ہمیں زد رقم
'مثنوی مولوی عقدہ کشای دلم'(۱۲۸۲ ھ)

مندرجہ بالا قطعہ تاریخ میں فکر رومی کے اثرات واضح کرتے ہوئے ان کے حق میں دعا کی گئی ہے اور مصرع تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ مثنوی معنوی مرے دل کے تمام عقدوں، مشکلوں یا شکوک کو حل کرنے میں معاون ہے۔ بحر رجز مطوی و مرفوع میں پانچ الفاظ کے ذریعے اس میں سے بھی دو لفظ ''مثنوی مولوی'' ہیں جو 'عقدہ کشای دلم' مرے دل کی عقدہ کشا ہے۔ نہایت موزوں اور برجستہ مصرعہ جس سے سال طباعت ۱۲۸۲ھ عیاں ہوتی ہے۔ چوتھا قطعہ تاریخ منشی خیالی رام کا موزوں کیا ہوا ہے۔ جو مندرجہ ذیل طور پر درج ہے۔

''ایضاً نتیجۂ فکر نا ثر رنگین کلام منشی خیالی رام متخلص بہ خیالی شاگرد رشید مولوی احسان

اللہ ممتاز غفر اللہ“

ے در زمان نیك و آن خوب و ہنگام سعید

مثنوی مولوی معنوی مرفوع شد

خوش خیالی راہ کج بگذاشت بہرسال راست

۲۳ مثنوی مولوی معنوی مطبوع شد

۱۲۹۵ ۱۲۸۲ھ = ۱۲۹۵-۲۳

یہ تاریخ صنعت تخرجہ میں موزوں کی گئی ہے۔ اصل چوتھے مصرعہ کے الفاظ سے بہ حساب ابجد بارہ سو پچانوے اعداد حاصل ہوتے ہیں۔ جو مطبوعہ سال سے (۲۳) تئیس عدد زیادہ ہیں لہذا پہلے مصرع میں ”کج“ بگذاشت کی سفارش کی گئی ہے ’کج‘ کے عدد ۲۳ ہوتے ہیں اس طرح ۱۲۹۵ میں سے ۲۳ نفی کر دینے پر ۱۲۸۲ھ کے اعداد موصول ہو جاتے ہیں۔ یہ دشواری اس لئے پیش آتی ہے کہ شاعر اپنے مکمل جملے کو بدلنا نہیں چاہتا جس سے واقعہ کی نوعیت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ کہ مثنوی مولوی معنوی مطبوع ہوگئی“ چھپ گئی۔ لہٰذا پہلے مصرعہ میں اس کا اشارہ کر دیا گیا۔ اس مصرعہ کو بھی کج کے ساتھ راست کا استعمال کر کے صنعت تضاد سے مرصع کر دیا گیا۔ اس قطعہ تاریخ میں دیگر قطعات کی مانند فکر مثنوی پر تبصرہ نہیں کیا گیا ہے۔ صرف اس کے شائع ہونے اور اس کے بنا پر وقت کی خوبی کو بیان کیا گیا ہے۔ شاعر نے تجربہ کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ایک اور قطعہ تاریخ سالم صنعت معنوں میں بھی موزوں کیا۔ اس قطعہ میں بھی طباعت اور وقت کی تعریف ہے۔ مثنوی پر کوئی تبصرہ نہیں ہے صرف ”مرغوب دل“ سے تاریخ حاصل کی گئی ہے۔ جس سے خود بخود تشریح ہو جاتی ہے۔

مثنوی مولوی روم شد مطبوع طبع — اهل مطبع را طبیعت بهر طبعش شامل است

در زمان نیك و وقت خوش خیالی مصر مصر — از عرب مسموع شد تاریخ ”مرغوب دل“ است(۱۲۸۲)

مندرجہ بالا قطعہ میں مثنوی کو ’مرغوب دل‘ کہہ کر انھیں دو الفاظ سے تاریخ نکال کر قطعہ کو موزوں کیا گیا ہے مکمل مصرع سے تاریخ نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بناوزن یا بحر کے چند الفاظ سے تاریخ حاصل کرنا دراصل تاریخ گوئی کی ابتدائی دور کی یاد دلاتا ہے جو انیسویں صدی میں نیک خیال نہیں کیا جاتا۔ بہرحال الفاظ کے اعداد کی جستجو اپنی جگہ مسلم ہے۔ عرب کی مناسبت سے مصر مصر کا استعمال مصرعہ کی خوبصورتی میں اضافہ کا باعث ہے۔ جس سے مقصود شہر شہر یعنی تمام دنیا ہے۔ چھٹا قطعہ تاریخ ساقی کا تحریر کردہ ہے۔ جس کا آغاز مندرجہ ذیل عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔

”ایضاً طبعزاد شاعر معرفت آگاہ ”تصوف دستگاہ محو عشق اللہ باقی شیخ محسن علی متخلص بہ ساقی.

من نیم ساقی فقط مست و خراب از عشق او — هر چه بینی در جهان سر در شراب از عشق او

چرخ در گرداب حیرت چون حباب از عشق او — موج طوفان خیز و دامان سحاب از عشق او

گـر گـریبـان چـاک گشتـه گـل به گلزار جهان — زلف سـنبـل نیـز دارد پیـچ و تـاب از عشـق او
در فـراق او نــه تــنهـا مـاه شـد شـب زنـده دار — چـون شـفـق در خـون نشستـه آفتاب از عشق او
نــی فــقــط فـریــادنـی دارد بســاز نـغـمــه اش — پـوسـت بـرتن میدرد چنگ و رباب از عشق او
والـه و شـوریـده از خـود رفتـه و مست الست — عــاشــق دیـوانــه را بـاشـد خـطـاب از عشـق او
چـرخ سر گردان زمین او فرط حیرت در سکون — در تـب و تـاب انـد مـاه و آفتـاب از عشـق او
میـکـده گــردیـده ام از جـوش صهبـای غـمــش — اخــگــری در پهــلـوم بـادل کبـاب از عشـق او
از مـقــامــاتــی کــه مــی گویم بـه استعداد خود — هـر یـکـی هـم گـفتـه دارد صد کتاب از عشق او
فــی الــحــقیــقــت مثــنوی مـولـوی مـعـنـوی — میــکــده آراستـــه بـــا آب و تـاب از عشـق او
بیـت بتیــش لـفـظ لـفـظـش شیشـه و سـاغر بود — بهــر رنـدان حـقیـقــت چون شـراب از عشق او
هــر کــه بیـنـد ایـن مــی کهـنــه نشـاط نو کند — دائـمــا بـاشـد زمستی شیخ و شـاب از عشق او
سـوی ایـن میـکــش سـوال حسـن خودارنی بود — لــن تــرانیهـــا بـــر آیـد در جـواب از عشـق او
ایــن مـی کهـنــه چـو از نـودرخـم مـطبـع رسیـد — گـر چــه پیـرم بـاز شد جوش شباب از عشق او
بــا کــمــال جـذب در مـنـقـوط گفتم سـال طبع — مثـنـوی مولوی جام شراب از عشق او (۱۲۸۲ ھ)

مندرجہ بالا قطعہ تاریخ میں شاعر نے صنعت منقوطہ کا استعمال کر کے اپنی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ آخری شعر کے پہلے مصرع میں اس راز کی نشاندہی اس طرح کی گئی ہے۔

ع باکمال جذب در منقوط گفتم سال طبع

اس اشارے کے بعد دوسرے مصرعہ کے تمام الفاظ کے صرف منقوط یعنی نقطے دار حروف کے اعداد شمار کر کے تاریخ حاصل کی گئی ہے۔ مصرع ہے۔ ع مثنوی مولوی جام شراب از عشق او

اس مصرعہ کے نقطہ دار حروف ث+ن+ی+ی+ج+ش+ب+ز+ش+ق+ کے اعداد کو جمع کر کے ۱۲۸۲ھ برآمد ہوتی ہے۔

۵۰۰+۵۰+۱۰+۱۰+۳+۳۰۰+۲+۷+۳۰۰+۱۰۰+ =۱۲۸۲

تاریخ مصرعہ کی اس خوبی کے علاوہ قطعہ کی ردیف ''از عشق او'' خود مثنوی کے مضامین کی عکاس ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی کی بہت سی خوبیاں اس قطعہ کے اشعار سے نمایاں ہیں۔ مثلاً یہ کہنا

فــی الــحــقیــقــت مثــنوی مـولـوی مـعـنـوی — میــکــده آراستـــه بـــا آب و تـاب از عشـق او
بیـت بتــش لـفـظ لـفـظـش شیشـه و سـاغر بود — بهــر رنـدان حـقیـقـت چـون شـراب از عشـق او

ساتواں قطعہ تاریخ نسیم دہلوی کا ہے۔ جسے مندرجہ ذیل عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے۔

"ایضاً من افادات همپا یه قدسی و کلیم مرزا اصغر علی خان متخلص به نسیم دهلوی"

چو کردم راست این نخل هزج از شاخ و برگ وبُن — بگفتم چاربار ای دل بیک مصرع مفاعیلن
نمودم از ثنای منشی ذیجاه آغازش — کشودم بهر سامع بعد آن هر عقدهٔ رازش
بیااى خاطر مشتاق سر کن داستانی را — که دارم زیر پا در شوق پابو سش جهانی را
دل دارم که مصروف کمال و فیض و اوصافش — اسیر دام و لطف و محو رمز خاطر صافش
بهمت بر سر مخلوق هردم بار احسانش — نه دیدم در جهان ذاتی نباشد آن که مهمانش
ضمیرش صورت آئینه شکل اندو و مطلب ها — هوس در خواب راحت از خیال جنبش لب ها
درین هنگام طبع مثنوی عارف کامل — که نامش مولوی روم و فیضش صیقل هردل
بخاطر جاگزین گردید و آسان گشت انجامش — چو جستم مصرعه تاریخ بهر فکر آزادش
اجازت شد بما از بهر سال طبع و اتمامش — نوشتم "ای ولی بود جان قربان ارشادش" (۱۲۸۲ھ)

مثنوی کے پیرایہ میں تحریر کردہ مندرجہ بالا تاریخ کے آخری مصرع سے 'نوشتم میں نے لکھا' جدا کر کے

ای ولی بود جان قربان ارشادش

کے اعداد شمار کرنے سے مثنوی کے شائع ہونے کا سال ۱۲۸۲ھ قرار پاتا ہے۔ مصرعہ بامعنی مولانا کی شخصیت اور مثنوی کی جامعیت کو نظر میں رکھ کر موزوں کیا گیا ہے۔ تاریخ کے دیگر مصرعوں سے بھی مثنوی اور اس کے مضامین پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ نسیم صاحب نے ہی ایک دوسری تاریخ عیسوی سنہ میں بھی موزوں کی ہے:

بحکم منشی عالی جنابی — بطبع، آمد کلام لاجوابی
کلامی آنکه مثلش در جهان نیست — باوج هر زمین و آسمان نیست
پی تاریخ ایمائی بماشد — بسال عیسوی دل آشنا شد
چنان مصراع نوزیب زبان کرد — حدیث از عشق حق عاشق بیان کرد (٢٨٦٦ ٥)

غالباً دوسرا مصرعہ تاریخ نکالنے کی وجہ ہجری کے ساتھ عیسوی سال کا نمایاں کرنا مقصود تھا۔ لیکن مصرعہ کی جامعیت اور تعریف بیان سے باہر ہے کہ

حدیث از عشق حق عاشق بیان کرد

مندرجہ بالا مصرعہ میں مثنوی معنوی کے اصل مفہوم کی روح در آئی ہے۔ گو مکمل مثنوی کے سمندر کو کوزہ میں سمانے کے مترادف

کر دیا ہے۔اس مصرعہ سے عیسوی سنہ ۱۸۶۶ء برآمد ہوتی ہے جو ۱۲۸۲ھ کے مطابق ہے اس تاریخ مثنوی کا دوسرا شعر بھی مثنوی کے تعریف میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ جوخصوصاً ۲۰۰۷ میں خوب واضح ہو چکا ہے۔اور ہنوز اس کا سلسلہ جاری وساری ہے وہ کلام جس کا مثل دنیا میں نہیں ہے۔ یہاں قرآن، حدیث رسول اور نہج البلاغہ کو مستثنا سمجھنا چاہئے۔

آخری میں صرف ایک شعر منشی کالکا پرشاد موجد کا تحریر کیا گیا ہے۔

؎ طبع شد چو خاتمہ موجد صفا نہاد   گفت سال عیسوی 'خاتمہ بخیر باد'(۱۸۶۵ء)

''خاتمہ بخیر باد'' سے ۱۸۶۵ء حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ نسیم صاحب نے ۱۸۶۶ کا مصرعہ برآمد کیا تھا۔ممکن ہے یہ دونوں سنین ۱۲۸۲ کے نزدیک رہیں ہوں اور دسمبر ۱۸۶۵ سے جنوری ۱۸۶۶ تک اشاعت کا کام جاری رہا ہو اور یہ دونوں عیسوی سال اپنی اپنی جگہ مسلم ہوں اس تاریخی مصرعہ کے بعد دو صفحات میں تقریظ تحریر کی گئی ہے اور جہاں کتاب کلی طور پر ختم ہوتی ہے وہاں مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے۔

مثنوی مولوی چون طبع شد   باکمال فضل قیوم و قوی

سال طبعش خامہ من زد رقم   'منطبع شد مونس جان مثنوی'(۱۲۹۱ھ)

یہ تاریخ مثنوی کے کسی دوسرے ایڈیشن جو اصل مثنوی کے نو سال بعد شائع کی گئی ہے۔اس کی رونق بڑھانے اور سال اشاعت کے لئے تحریر کی گئی ہے گویا دوبارہ یہ مثنوی ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوئی۔ یا اس مثنوی کا ایک ایڈیشن ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوا۔

مثنوی معنوی کا ایک ترجمہ مطبع معین الاسلام واقع اجمیر میں اشاعت کے منزلوں سے گزرا تو اس کی اشاعت کے لئے ایک قطعہ اردو زبان میں تحریر کیا گیا ہے جس کا آخری شعر مندرجہ ذیل ہے جس سے اشاعت کا سال ۱۳۱۱ھ برآمد ہوتا ہے۔

؎ یہ دے اس کی ''تاریخ میں'' شعر لکھ کر   ''سنہ مثنوی شریف'' اس سے بہتر

۱۳۱۱ ھ   ۱۳۱۱ ھ

مندرجہ بالا شعر کے پہلے مصرعے کے دو الفاظ ''تاریخ میں'' کے اعداد شمار کرنے پر ۱۳۱۱ھ برآمد ہوتی ہے، اس طرح دوسرے مصرع کے پہلے جز ''سنہ مثنوی شریف'' سے سال اشاعت ۱۳۱۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ منشی عبدالرحیم خاں صاحب رحیم رئیس عظیم آباد کا کیا ہوا ہے جو مرزا غالب کے شاگرد تھے۔

مثنوی مولانا روم کا ایک اور ترجمہ ۱۳۰۹ھ میں ''بوستان معرفت'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ 'بوستان معرفت' اس ترجمہ کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۰۹ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ترجمہ ''بوستان معرفت شرح اردو مثنوی مولوی روم تالیف شرح جناب مولوی عبدالمجید خاں صاحب پیلبھیت'' کا لکھا ہوا ہے۔ جو منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔اس ترجمے کا دوسرا دفتر ۱۳۱۰ھ میں نولکشور پریس سے شائع ہوا جس کے ص ۲۸۷ پر مندرجہ ذیل تاریخ موزوں کر کے درج کی گئی ہے۔

؎نام بھی میرا تو ہے عبد المجید پھر عجب کیا تجھ سے اے رب مجید
اب مجھے اک عرض کرنا ہے ضرور ناظرینوں، شائقینوں کے حضور
اک معز اللہ خاں میرا عزیز ہے عزیز ودلپذیر و با تمیز
پہلا دفتر تیرہ سو نو میں ہوا اور یہ تیرہ سودس میں ہے لکھا
میں لکھوں تاریخ اس کی بر ملا یعنی ''یہ ہے گلشن فیض ہدا''(۱۳۱۰ھ)

مندرجہ بالا نظم میں صوری اور معنوی دونوں تاریخیں درج ہیں۔ تیرہ سونو اور تیرہ سودس کی صوری تاریخیں ہیں تو ''یہ ہے فیض ہدا'' سے معنوی تاریخ اس کے الفاظ کے اعداد نے پر ۱۳۱۰ھ حاصل ہوتی ہے شمار کر کے مثنوی معنوی کے مذکورہ ترجمے کا چوتھا دفتر اگست ۱۹۱۴ء مطابق رمضان ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا پھر پانچواں دفتر بھی چوتھے دفتر کے ساتھ مندرجہ بالا تاریخ وسال میں ہی شائع ہوگیا۔ ان دونوں جلدوں کی اشاعت پر کوئی تاریخ رقم نہیں کی گئی ہے۔ لیکن جب چھٹا دفتر ستمبر ۱۹۱۴ء مطابق شوال ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا تھا تو اس کے ص ۳۸۸ پر مندرجہ ذیل صوری تاریخ تحریر کی گئی ہے۔

؎تیرہ سو بارہ صفر میں اے ھمام ہو گیا یہ دفتر سادس تمام

مثنوی معنوی کی ایک شرح ''شجرہ معرفت'' کے نام سے ۱۲۹۸ھ میں نول کشور پریس سے ہی شائع ہوئی جو اس شرح کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۸ھ برآمد ہوتی ہے۔ اسی نام کو مندرجہ ذیل عنوان کے ساتھ ایک قطعہ میں پرو دیا گیا ہے۔

بفضل خدای جہان آفرین شد این ترجمہ ختم بالعافیت
پی نام تاریخی آن شدم بگفتاد خرد ''شجرہ معرفت''

۱۲۹۸ ھ

یہ ترجمہ مولوی غلام حیدر صاحب رئیس قصبہ گوپا مو نے نظم کی شکل میں تحریر کر کے مطبع نولکشور لکھنؤ میں چھپوایا جس کا مطلع اس طرح ہے۔

؎نی سے کیا حمد الٰہی ہو بیاں کیا بتائے وہ نشان بے نشاں

مثنوی معنوی کے چھٹے دفتر کا ایک ترجمہ: پیراہن یوسفی ترجمہ دفتر ششم مثنوی مولوی معنوی کے عنوان سے مولوی محمد یوسف علی شاہ گلشن آبادی نے منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع کیا جس کے ص ۳۴۱ پر منشی بھگوان دیال عاقل نے تاریخ موزوں کر کے اس کتاب کی زینت میں اضافہ کیا ہے۔

گشت شائع از عنایات خدا بار ششم ترجمان مثنوی مولوی معنوی
کلک عاقل مصرع تاریخ ہجری زد رقم طبع شد قرآن مزیب در زبان پارسی (۱۳۳۲ھ)

یہ مصرعہ مکمل اور واقعے کو پوری طرح بیان کرنے والا ہے۔ اسی اشاعت کے لئے ایک اور مندرجہ ذیل تاریخ مولوی حامد علی خاں صاحب

حامد شاہ آبادی نے بھی موزوں کی تھی جو زیب کتاب ہے

ے این چه بحریست با خلاق تصوف که ازو — ہست جاری زعجم تا بعرب چشمه فیض

خامه حامد سر گشته بسال طبعش — فی البدیهه بنوشت "ای چه عجب چشمهٔ فیض"

(۱۳۳۲ ھ)

''ای چہ عجب چشمۂ فیض'' کے الفاظ اور حروف سے ۱۳۳۲ء برآمد ہوتی ہے۔

ان تراجم و شرحوں کے علاوہ اور بھی شرحیں و تراجم شائع ہوئے جن میں مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی کی شرح بھی ہے لیکن اکثر ان شرحوں پر تاریخی قطعات درج نہیں ہیں۔ غالبًا اس دور کا آخری ترجمہ جو مولانا سجاد حسین نے کیا ہے اور جو ۱۹۷۶ء مطابق ۱۳۹۶ھ میں اشاعت کی منزلوں سے گذرا ہے۔ اس پر خلیق ٹونکی کا پیش کردہ ایک قطعہ تاریخ اشاعت درج کیا گیا ہے۔ جس کے نثری عنوان سے ۱۹۷۶ اور نظم سے ۱۳۹۶ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ ''پیش کنندہ احقر خلیق ٹونکی'' سے عیسوی سال ۱۹۷۶ برآمد ہوتا ہے تو مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ سے

دورۂ تہران و ترکی مصر و بغداد و عرب — ہو مبارک صاحب عزو شرف بہ فضل رب

مثنوی کے شارح و فاضل مترجم مرحبا — مولوی سجاد بحر علم صدر شک عرب (۱۳۹۶ھ)

مندرجہ بالا قطعہ کے آخری شعر میں مثنوی کے شارح کی تعریف کرتے ہوئے دوسرے مصرعہ میں سجاد صاحب کی مبالغہ آمیز تعریفی مصرعہ ''مولوی سجاد بحر علم صدر شك عرب'' سے ۱۳۹۶ھ سال اشاعت موزوں ہوتی ہے۔

اس مضمون کے آخر میں مولانا روم سے منسوب سال ۲۰۰۷ سے متاثر ہو کر خود مقالہ نگار نے ایک تاریخ صنعت سنین صوری و معنوی میں موزوں کی تھی۔ مولانا کے سلسلے میں تاریخ گوئی کی یہ روایت بالکل انوکھی ہے غالبًا اتنی تاریخیں کسی بھی فارسی کی نظم یا نثر کی کتاب کے سلسلے میں موزوں نہیں کی گئی ہیں جتنی مولانا روم سے متعلق ملتی ہیں اور خود یونسکو نے بھی مولانا کی شخصیت اور افکار سے متاثر ہو کر اہل زمانہ پر اس مثنوی کے نکات اور رموز کے انکشاف کے لئے ۲۰۰۷ء کو مولانا سے منسوب کیا تھا۔ جس کے تحت دنیا کے کونے کونے میں مولانا پر سیمینار بھی ہوئے تھے اور مقالے بھی شائع کئے گئے تھے۔ اور خود راقم نے صنعت سنین صوری و معنوی میں مندرجہ ذیل تاریخ موزوں کی۔ از نتیجۂ فکر عراق رضا زیدی سیتھلی

ے جستجوی زندگی خواهد اگر باشاد کام — فکر رومی عام کن از امرکه تاهند خاک

گفت زیدی در فن تاریخ این دو آتشه — دو هزار و هفت سال روم یونسکو دراک (۱۴۲۸ھ)

اس قطعہ کے آخری مصرع سے صوتی تاریخ ۲۰۰۷ اور معنوی تاریخ ۱۴۲۸ھ برآمد ہوتی ہے۔ اور یہی مقالہ نگار کی روح رومی کی خدمت میں ایک ادنی سی سوغات خراج عقیدت ہے۔ ☆☆☆

فارسی زبان کی ہمہ گیر مقبولیت

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، صدر شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

اگر چہ ہندوستان میں فارسی زبان کا روشن وتابناک آفتاب روز بروز ڈھلتا جا رہا ہے لیکن جب ہم ایک طائرانہ نگاہ ایشیائی ممالک پر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فارسی ہی ایسی زبان ہے جس نے ہر ملک اور کلچر میں اپنے اثرات چھوڑے ہیں اور اپنی حرارت کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھا ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ زبان خصوصاً کافی اہمیت اور توجہ کی حامل ہے کیونکہ اردو، ہندی، سنسکرت کسی بھی زبان کو لیجئے اس میں اس کا عنصر موجود ہے اردو زبان میں تو اس کا بیش بہا حصہ ہے ہی دیگر زبانوں میں مختلف اصناف میں فارسی زبان کے مختلف الفاظ رائج ہیں۔ فارسی زبان کا خزانہ استعاروں، محاوروں، کنایوں اور تشبیہات سے مالا مال ہے۔ فارسی زبان اپنے ان جواہرات سے نظم ونثر کی سادہ یا رنگین عبارتوں کو جس انداز میں پیش کرنا چاہے اس میں پیش کر دیتی ہے اور ادائے مطلب میں وہ خوبی اور صفات پیدا کر دیتی ہے جو اس صنف کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ فارسی زبان کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اپنے انداز بیان اور خوبصورت الفاظ میں ہر پیکر میں خوش نما نظر آتی ہے اس کی زمین انشاء پردازی کی گل کاری میں جیسی نثر کے لئے مناسب ہے ویسی ہی نظم کے حق میں اپنی ترکیب اور ادائیگی مطلب کے اعتبار سے موزوں ہے۔ ہر سلطنت ہر اقلیم میں اس کو پسند کیا گیا ہے اور ہر اہل ذوق اس زبان کے حق میں معترف رہا ہے۔

فارسی زبان کیونکہ عام فہم اور سہل ہے مطلب کی ادائیگی میں مختصر، گفتگو خوشگوار اور شیرینی سے لبریز ہے۔ زبان خواہ کوئی بھی ہو اس کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک کے ملک کی تاریخ، ملک کے حالات، وہاں کا جغرافیہ اور قوم کے عادات واطوار، اس کے رسم ورواج، تہذیب وتمدن سے بخوبی واقفیت اور شناسائی نہ ہو۔ فارسی زبان کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کی شیرینی گفتار نے اس میں بہت سے نازک اور باریک لطف پیدا کر دئے ہیں اس لئے اس کی اصطلاحوں اور اشاروں اور کنایوں کا کچھ شمار نہیں ہے۔ فارسی زبان کی ان خوبیوں کو مختلف زبان دانوں نے اس میں پایا ہے۔ اس کے ہر فقرے ہر جملے میں ایک ایسا نکتہ پوشیدہ اور ہر بات میں ایک لطیفہ پنہاں ہے اور جن استعاروں اور تشبیہوں سے مرصع ہے ان کی بنیاد ضرور کسی نہ کسی ملکی خصوصیت پر مبنی ہے اور جس میں ملک کے حالات اور رہن سہن کے طور طریق اور رسم ورواج، لوگوں کا ایک دوسرے سے راہ ورسم، طرز لباس، آداب زندگی کے قاعدے ان سب کو دخل ہے اور انہی کی بنا پر وہ دلکش محاورے، رنگین استعارے، چبھتے اشارے، کھٹکتے ہوئے کنائے قرار پائے ہیں جو اس کی انشاء پردازی کو دیگر زبانوں کی فصاحت سے منفرد وممتاز دکھائی دیتی ہے۔

زبان کیونکر بنتی ہے اور کیسے نشو ونما پاتی ہے اس میں کیا کیا تغیرات رونما ہوتے ہیں ان کے اسباب کیا ہیں۔ ادب پر حکومت، ماحول اور دوسرے تاریخی حالات وانقلابات کا کیا اثر ہوتا ہے ادیب کے کلام کی خوبیاں اور حسن کو کس انداز میں بیان سے پیش کرنا ہے ان

سب باتوں کو فارسی زبان میں کمال حاصل ہے اس کا انداز بیان دلکش اور مختصر ہوتا ہے کہ دوسری زبان میں اس کی اتنی وسیع گنجائش نہیں ہے۔ فارسی زبان کی لغت میں سینکڑوں الفاظ ایسے موجود ہیں جو کہ ایک دوسرے کے ہم معنی یا مترادف ہیں جن کا دوسری زبان میں ملنا نہایت مشکل اور ادبی پیرایہ سے استعمال میں کافی فرق نظر آتا ہے۔

اس بات سے الگ ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو فارسی زبان میں استعارہ، تشبیہ، حسن تعلیل، مراۃ النظیر، تلمیح کا استعمال بھی جس خوبی سے کیا جاتا ہے دوسری زبانوں میں اتنی برجستگی اور تسلسل سے کم نظر آتا ہے۔ فارسی زبان تاریخی اعتبار سے بھی کافی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ ملک کی تاریخ اس زبان میں لکھی گئی ہے۔ سرکاری زبان بھی فارسی ہی رہی ہے اور پرانے عہدنامے وغیرہ بھی ہم کو فارسی زبان میں ملتے ہیں۔ فارسی زبان کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جتنے اعلیٰ پایہ کے شعراء گزرے ہیں جنھوں نے اردو اور فارسی میں شاعری کی ہے ان کی بھی فارسی شاعری زیادہ مقبول ہوئی غالبؔ اور اقبال اس کی زندہ مثال ہیں۔ غالبؔ کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا ان کا فارسی کلام ان کے اردو کلام سے چھ گنا زیادہ ہے وہ اپنی فارسی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں:

فارسی بین تا به بینی نقشهائے رنگ رنگ بگذر از مجموعهٔ اردو که بیرنگ من است

علامہ اقبال کی مثنوی اسرار خودی اور رموز بیخودی کا ایک شعر ہی ہمارے قلب میں خودی کے جذبے کو ایسا بیدار کرتا ہے جو ہماری زندگی کا سرمایہ حیات بن جاتا ہے آج کے دور میں جبکہ ادبی ذوق وشوق لوگوں میں کم ہوتا جارہا ہے ادبی مجالس کا زور کم ہورہا ہے اس کے باوجود جو اہل مرعوب و متاثر کئے ہوئے ہیں۔ اور ان تصانیف کی روز بروز بڑھتی مقبولیت چلی جارہی ہے۔ فارسی زبان کا اثر دنیا کی بیشتر زبانوں پر زیادہ ہے اس زبان کا مزاج اتنا عام فہم ہے کہ جو لوگ تھوڑا بھی ادراک وفہم رکھتے ہیں اور اپنی توجہ اس طرف مبذول کرتے ہیں ان کو بآسانی سمجھ میں آتی ہے اور ان کی شیرینی اور مدھم انداز لوگوں کے ذہنوں پر اپنا اثر ضرور ڈالتی ہے۔

دوسری زبانوں کی ادبی کتابوں کا ترجمہ جس قدر فارسی زبان میں ہوا ہے اتنا شاید ہی کسی زبان میں ہوا ہو۔ اور سنسکرت میں بھی اس کا کافی اثر ہے پنچ تنترا، ہت اپدیش کا جو ترجمہ جو فارسی زبان میں ہوا ہے اس کا جواب نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ذریعہ اس میں اخلاقی، تہذیبی، طبی اور دیگر علوم کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہت اوپدیش کو بھی کافی ابواب میں بانٹا گیا ہے جن کی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک الگ مقام اور الگ اہمیت ہے اسی طرح نظامؔی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ لکھا اور چاروں مقالوں میں الگ قسم کی تعلیم دی ہے۔ مقالہ اول در ماہیت دبیری میں انہوں نے جس انداز سے تحریر کی ہے اس کو پڑھنے سے اس دور کی تاریخ، سلطنت، جنگ کے طریقہ، رعایا پر حکومت، علمی وادبی اہمیت سب کو مدنظر رکھا ہے اور خصوصاً عربی امثال یا آیات کو جس طرح فارسی زبان میں مبدل کر کے ان کا استعمال کیا ہے اس کو اور کسی زبان میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ عربی کلمات کا استعمال فارسی زبان کے ذریعہ اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ کہیں معنی میں فرق نہیں آنے پاتا ہے۔

اسی طرح جو ہندوستانی شعراء فارسی زبان میں شاعری کرتے رہے دوسری زبان کے شعراء اس مرتبہ کو حاصل نہیں کر سکے۔

فارسی زبان کے مختلف پہلوؤں کو اگر بہت وسیع القلبی اور وسیع النظری سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان کی قدر و قیمت میں ادبی نزول کے باوجود بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فارسی زندہ ہے اور وہ اپنے دامن کو ابھی بھی کافی دور تک پھیلائے ہوئے ہے یہی اقبال مند زبان ہے جس کو ہر دور میں وہ عروج حاصل تھا کہ اور زبانوں کے چراغ اس کے آگے مدہم و ماند پڑ گئے اور تمام دفاتر کے کام اور تاریخ فارسی میں لکھی جاتی تھی۔ بطور مثال تاریخ طبری، تاریخ بیہقی فارسی میں لکھی گئیں۔ رودکیؔ جسے فارسی شاعری کا آدم اول کہا جاتا ہے اور اسی زبان کے اعلیٰ پایہ شاعر سعدیؔ شیرازی کی گلستان و بوستان اپنے دور کی فارسی زبان کی بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ جن کا نثر اور نظم دونوں میں الگ مرتبہ ہے فارسی نثر نگاری میں تاریخ جہاں گشا، مقامات حمیدی، چہار مقالہ، سفر نامہ ناصر خسرو، روشنائی نامہ، انوار سہیلی، مثنوی مولانا رومؔ جیسی بیشمار تصانیف ہیں جن کا اپنا ایک مقام اور اہمیت ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی ہے۔ روضۃ الشہداء، روضۃ الصفا، حبیب السیر ان سب تصانیف میں مصنفین نے اپنی تحریر کو اس کے قالب میں ڈھالا ہے اور ان کا اپنا ایک الگ معیار ہے۔ انشاء پردازی کے اعتبار سے دیکھیں تو فارسی میں انشاء پردازی کے میدان میں بہت سے اعلی پایہ انشاء پرداز پیدا ہوئے۔ اکبری اور جہانگیری دور کے مصنفین کی کئی تصانیف ہیں اور اس دور میں انشاء پردازی میں ابوالفضل کو اس صنف کا فرماں روا کہا جاتا ہے۔ اکبر نامہ، مراسلات شاہی، کلیلہ و دمنہ کا فارسی ترجمہ، مہابھارت کا ترجمہ، آئین اکبری ان تمام تحریروں میں فارسی زبان میں خوشنما انداز بیان نئے نئے فقرے عبارت کی شان شگفتگی بیان ادائے مطلب کے انداز عیش برجستہ و مناسب ہر پہلو سے اور ہر انداز سے چاہے فارسی زبان کو دیکھیں تو یہی عالم ہے۔ حکیمانہ، عالمانہ، صوفیانہ، دوستانہ اقسام سخن کی جس عبارت کو دیکھیں انہیں سنجیدہ و برگزیدہ خیالات، مناسب الفاظ برجستہ برمحل الفاظ و عبارت میں ادا کیا گیا ہے اور واقعی اس زبان کا کمال ہے کہ اسے جس سانچے میں جس پیکر میں ڈھالا تو یہ زبان اس میں پرکشش نظر آتی ہے۔ فارسی زبان کے لئے یہ کہنا بالکل بھی مشکل نہیں کہ اس کا تاریخ فلسفہ فروغ ریاضی، علم الارض، علم الحیوانات، اخلاق وغیرہ میں بھی اس کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ درحقیقت فارسی زبان عمیق اور وسیع ہونے کے ساتھ شیریں زبان ہے۔

فارسی زبان و ادب میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ زمانہ بدلتا گیا، تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ فردوسیؔ کی شاہکار مثنوی شاہنامہ ہو، سعدیؔ شیرازی کی گلستان و بوستان ہو یا مولانا روم کی 'مثنوی مولوی معنوی' ان تمام ادبی شہ پاروں کا ترجمہ دنیا کی کم و بیش تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔ فارسی زبان کی ہمہ گیر مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ ایشیائی ممالک کے علاوہ امریکہ، انگلینڈ کی دانشگاہوں میں بھی فارسی کی قدیم تاریخ، علم لغت پر کام کیا جا رہا ہے اور مستقبل میں اور بھی کام ہونے کے امکانات ہیں۔

☆☆☆

رسواؔ ہری پوری کی فارسی غزلیات میں جمالیاتی حسن

عبدالکریم، ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

فارسی شاعری کے ابتدائی متحرک اسباب میں جوش فطرت کا عنصر کم اور کسب معاش کا تقاضہ زیادہ رہا ہے۔ اس بنیاد پر قصیدہ کو فارسی کی اوّلین اصناف سخن میں سے ایک اہم صنف کہا جا سکتا ہے۔ عربی قصاید میں عشقیہ اشعار کہنے کا رواج تھا جسے تشبیب کہتے ہیں یہی غزل کی ابتدائی شکل ہے۔ چنانچہ بعد میں عشقیہ اشعار کو الگ سے بیان کرنے کا طریقہ رائج ہوا جس سے غزل کی بنیاد پڑی۔ رفتہ رفتہ اس نےخاصی وسعت حاصل کر لی جو دیگر اصناف سخن کے مقابلے زیادہ شہرت و پسندیدگی کا باعث بنی۔

غزل کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اظہار خیال کے لئے اس کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس کی ہمہ گیر تاثیر کے باعث اس میں ہر قسم کے مضامین کے سمانے اور نبھانے کی بے پناہ استعداد موجود ہے۔ اس طرح غزل، حُسن و عشق، خوشی و غم، نالہ و نغمہ، خلوص و فریب، امید و یاس، سکون و اضطراب، وفاداری و جفاکشی، جلوہ نمائی اور دلفریبی جیسے بے شمار دلی جذبات و کیفیات کے اظہار کی ترجمانی کا حسین آلہ ہے۔

رسواؔ ہری پوری (۱۹۴۹-۱۹۰۱ء) کی غزلوں میں کلاسیکی روایت کا آہنگ مجموعی طور پر موجود ہے۔ انداز کلام اور ندرت بیان میں سلاست بھی ہے اور روانی بھی۔ سبک خراسانی کی چاشنی بھی ہے اور سبک بازگشت کی شگفتگی بھی۔ سوز و گداز میں سعدیؔ کی جھلک اور مستی اور سرشاری میں حافظؔ کا تتبع نمایاں ہے۔

از غم دنیا کہ او آزاد نیست   بیگمان در ملك راحت شاد نیست

بہر شیرین جانِ شیرین گر نداد   تیشه زن مزدور اوفرہاد نیست(۲)

جو آدمی دنیا وی خواہشات سے آزاد نہیں ہوتا ہے وہ بلاشبہ کشور آسایش و آرام میں خوش و خرّم نہیں رہتا۔ شیریں کی خاطر (وادی عشق میں) جس نے اپنی جان عزیز کو قربان نہیں کیا وہ تیشہ چلانے والا مزدور ہو سکتا ہے، فرہاد (سچا عاشق) نہیں۔ یہاں شیریں فرہاد کی عشقیہ داستان کو بطور تلمیح نظم کر کے مضمون کو وسعت بخشی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ پیغام دیا گیا ہے کہ عشق جستجو، طلب اور محنت کا نام ہے عیّاشی کا نہیں۔

ایں چه بازیہا نماید نو بنو عیارِ ما   کو بغارت می برد ہوش از دلِ ہشیارِ ما

از پی یك دل ربودن حیله ہا دارد دوصد   ما ورایش مکرہا داند چه خوش مکارِ ما (۲)

ہمارا چاق و چوبند معشوق کس قدر تازہ بہ تازہ کھیل تماشا دکھاتا رہتا ہے۔ ہمارے ہوشیار دل کے ہوش و حواس پر ڈاکہ ڈالتا رہتا ہے۔ ایک دل کو اچکنے کی خاطر سینکڑوں حیلے بہانے کرتا ہے۔ ہمارا انتہائی مکّار معشوق اس کے علاوہ بھی بہت سے داؤں پیچ سے واقف ہے۔ شاعر نے معشوق کی دلفریبی، بانکپن اور جور و جفا کا اظہار بہت ہی لطیف پیرایہ میں کیا ہے۔ تشبیہات جو فارسی کلاسیکی شاعری کا خاصہ ہے۔ بیشتر شعراء نے تشبیہات سے اپنے کلام کو مزیّن کیا ہے۔ مثلاً عارض کو لالہ سے۔ زلف کو کفر، زنجیر، سنبل، دام، کمند، رات اور چور وغیرہ سے۔ خال کو نقطہ اور دانے وغیرہ سے۔ ابرو کو کمان اور محراب سے۔ سرو کو قد سے۔ چہرے کو چراغ، گل اور ماہ وغیرہ سے۔ دہن کو غنچہ اور پستہ سے۔ لب کو عناب اور برگ گل سے۔ خط کو ریحان سے، دانتوں کو مرجان اور انار کے دانوں سے، زنخداں (ٹھوڑی کے نچلے حصّے کا گڑھا) کو چاہ اور سیب کے نچلے حصہ سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے۔

دلی دارم کہ او ہمراہ صد آہ و فغاں دارد   ز بہرِ گل رخی ہر دم نوای بلبلاں دارد

بجای شربت آمد بہرِ ما خونِ جگر خوردن   ببیں ساقی بہ چشمم را کہ جامِ خونچکان دارد(۳)

میرے پاس ایسا دل ہے جو سینکڑوں آہ و فغاں کا حامل ہو کر محبوب کی خاطر ہر لمحہ بلبل کی طرح نغمہ سرائی کرتا رہتا ہے۔ ہمارے نصیب میں شربت کی جگہ خون جگر پینا تھا (آرام کی جگہ تکلیف اٹھانی تھی) ساقی! میری آنکھوں کو دیکھ جو جام خونچکان کے مانند ہیں (یعنی ایسا جام جو خون سے لبریز ہے)۔ یاد رہے کہ محبوب کی خوبصورت آنکھوں کو چھلکتے ہوئے پیمانوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ میؔر نے اردو میں کہا ہے۔

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے

رسوؔا کے اشعار میں شوخی اور نکتہ سنجی بھی نہایت دلکش اور اچھوتے انداز میں ملتی ہے۔ احساس کی نزاکت اور بیان کی قدرت میں جداگانہ تاثیر ہے۔ جو صف دوم کے شعرا کے کلام سے منفرد نظر آتی ہے۔

من ایں شکوہ بکہ گویم کہ ز شمشیرِ ابرویش   تنِ من زیرِ پیراہن دو صد زخمِ نہان دارد

خدا را از نگاہش سینہ ام غربال شد ہی ہی   نگارِ من عجب آن تیرہای بیکمان دارد (۴)

میں اس بات کا شکوہ کس سے کروں کہ اس کے ابروؤں کی تلوار نے مجھے کس طرح زخمی کیا ہے کہ میرا جسم زیر لباس سینکڑوں ایسے زخموں کا حامل جنہیں دکھایا نہیں جا سکتا۔ اس کی نگاہ کے تیروں سے میرا سینہ چھلنی ہو گیا ہے۔ میرے محبوب کے پاس بغیر کمان کے عجیب و غریب تیر ہیں۔ مراد یہ ہے کہ معشوق کی ترچھی نگاہیں تیروں کا کام انجام دے رہی ہیں اور ابروؤں سے تلوار اور کمان کا کام لیا جا رہا ہے۔ جب معشوق اسقدر اسلحوں سے آراستہ ہو کر برسر پیکار ہو تو عاشق کا سہی سلامت رہنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں شاعر کی وفا

پرستی بھی ضرب المثل ہے کہ سینکڑوں زخم کھانے کے بعد بھی پوچھتا ہے کہ میں شکوہ کس سے کروں۔
غالب نے اردو میں کہا ہے۔

نظر کہیں نہ لگے ان کے دست و باز وکو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ز نوکِ ہر مژہ شام و سحر در سفتنی دارم عروسِ دردِ من اندر گلو ہار گران دارد

بسوزِ غم دلم تفتید ازو بوی کباب آید بشکلِ آہ دودِ دل رخ اندر آسمان دارد (۵)

پلک کی ہرنوک سے صبح وشام آنسوؤں کی شکل میں موتی پروتا رہتا ہوں۔لگا تار آنسوؤں کی بارش سے میرے گلے تک جو نشان پڑ گئے ہیں وہ دلہن کے بھاری ہار کے مانند لگنے لگے ہیں۔سوزغم سے میرا دل تپنے لگا ہے۔جس سے کباب کی بُو آ رہی ہے۔دل کا دھواں آہ کی بھیس میں آسمان کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ ایسی خوبصورت اور انوکھی تشبیہ نے مضمون کی وسعت کو بڑھاتے ہوئے شعر کی دلکشی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

شیخ سعدیؔ فرماتے ہیں:

ندانم ابروی شوخت چگونہ محرابی است

اگر ببیند زندیق در نماز آید (۶)

میں نہیں جانتا کہ محبوب کی ابروؤں نےکیسی محرابی شکل اختیار کر رکھی ہے۔اگر کافر بھی دیکھ لے تو نماز میں شامل ہونے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ یعنی محبوب کی محراب نما ابروؤں کی شوخی میں وہ تاثیر ہے کہ کوئی بھی اس کے عشق میں گرفتار ہونے سے بچ نہ سکے گا۔کیونکہ عشق کی تاثیر ہمہ گیر ہے۔جس میں مذہب ومسلک کے تفریق کی قطعی گنجائش نہیں۔جس دل میں عشق کا گھر ہوتا ہے وہ دل جملہ عیوب سے پاک ہوتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ عشق طلب ہے اور حُسن تقاضا۔عشق میں چون و چرا کے لئے بالکل جگہ نہیں۔جو لوگ عشق کے نام پر شور مچاتے پھرتے ہیں ان کا عشق کامل درجہ کا نہیں۔ایسے میں صرف اور صرف ریا کاری ہی ان کے ہاتھ لگتی ہے۔

حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

می ترسم از خرابی ایمان کہ می برد

محراب ابروی توحضوراز نماز من (۷)

مجھے خوف ہے کہ کہیں میرا ایمان کمزور نہ پڑ جائے جو مجھے تیری محراب نما ابروؤں میں نماز ادا کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

یعنی نماز کی حالت میں اگر تیرے ابرو کے محراب کا تصوّر آ جاتا ہے تو نماز میں یکسوئی اور دل لگی جاتی رہتی ہے۔ دل تمہارے ابروؤں کے خیال میں کہیں سے کہیں نکل پڑتا ہے۔ یعنی جس محراب کے تصوّر میں نماز شروع کی تھی اس محراب کی جگہ تیرے ابروؤں کی محراب نے لے لی۔ لہذا نماز کی حالت میں دل کا اس طرح بھٹکنا ایمان کی خرابی کی دلیل ہے۔

در نمازم خم ابروی تو چون یاد آمد

حالتی رفت کہ محراب بفریاد آمد (۹)

نماز میں، جب مجھے تیرے ابرو کا خم یاد آ گیا تو ایسی حالت ہوگئی کہ محراب بھی خود فریاد کرنے لگی۔ یعنی میری بے تابی کو دیکھ کر، محراب آہ و نالہ میں مشغول ہوگئی۔ جس خصوع و خضوع سے میں نماز میں مشغول تھا وہ حالت تیری ابروؤں کی یاد نے یکسر بدل دی۔ شاعر نے ابروؤں کے خم کو محراب سے تشبیہ دے کر مضمون کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔

نمازدرخم آن ابروان محرابی

کسی کند کہ بخون جگر طہارت کرد (۹)

ان محرابی ابروؤں کے خم میں نماز وہی شخص پڑھ سکتا ہے جس نے خون جگر سے وضو کیا ہو۔ مفہوم یہ ہے کہ جس نے بہت ہی جگر کوشی کے ساتھ عشق کی دشوار گداز ناہموار راستے سے گزر نہ کیا ہو وہ ہرگز ان محرابی ابروؤں کے خم میں نماز ادا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو دل تیغ حُسن سے گھائل نہ ہوا ہو وہ عشق میں کامل درجہ تک نہیں پہونچ سکتا۔ لہذا عشق کی راہ سے گزرنے کے لئے بے انتہا صبر، اعلی درجہ کا ضبط، مصمم ارادہ، بلند حوصلہ درکار ہے۔ یہی شاعر کا پیغام عمل ہے۔

طوطی ہند امیر خسرو فرماتے ہیں۔

راست کردی زابروان محراب

می نماید نماز خواہی کرد(۱۰)

ابروؤں سے تو نے محراب درست کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے۔ یعنی معشوق کی ابروؤں میں جو دلکشی، عمدگی، ہمواری، دلبری اور دلداری کی نمائندگی اور مناسبت پائی جاتی ہے اس سے محراب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اسلئے محبوب کا ان ساری خوبیوں کے ساتھ ابروؤں کو محراب کی طرح استوار کرنا ایسا لگتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے۔

مشتبہ شویم قبلہ از رویت چہ کنم

کز ابرویت درچشمم بدو محراب افتاد (۱۱)

تیرا چہرہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ میں دھوکا سا ہوتا ہے، کیونکہ مجھ کو تیرے ابرو سے دو محرابیں نظر آتی ہیں۔ کیونکہ عام قائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا قبلہ کعبہ شریف ہے جو ایک محراب کے اندر ہے۔ مگر تیرا چہرہ دیکھ کر اس لئے دھوکہ میں پڑ جاتا ہوں کیونکہ تیرے ابروؤں سے مجھے دو محراب نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں فیصلہ نہیں کر پاتا ہوں کہ کس محراب کو حقیقی مان کر قبلہ کا یقین کرلوں۔

رسؔوا کے کلام میں جمالیاتی پہلو کا انداز بھی بہت دلکش ہے ملاحظہ فرمایں:

مردمان را عید آمد دیدنِ روی ہلال

ہست در عالم ہلال عید ما ابروی تو (۱۲)

طاق مسجد را چہ سازم حاجتی از دیرنی

عاشقان را ہست محرابِ دعا ابروی تو (۱۳)

ہلال یعنی پہلی تاریخ کا چاند دیکھ کر لوگوں میں عید کی خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ لیکن دنیا میں تیرا ابرو ہی میرے لئے ہلال عید ہے۔ یعنی جو خوشی لوگوں کو عید کا چاند دیکھ کر ہوتی ہے وہی خوشی مجھے تمہاری ابروؤں کو دیکھ کر ہو رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ لوگ اپنی اپنی مراد کی تکمیل کے لئے مندر و مسجد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اپنے اپنے طریقے سے عبادت کرتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عاشقوں کو مراد حاصل کرنیکے لئے ان عبادتگاہوں کی بالکل ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ تیرے ابروؤں کے محراب تلے ہی دعا مانگنا کافی ہے۔ یہیں سے ساری حاجتیں پوری ہوسکتی ہیں اور یہی عاشقوں کا شیوہ ہے۔

در نقابِ لالہ گون پنہان رخِ محبوب شد	در گمانم آفتاب اندر شفق محجوب شد
ماہِ من بر روی انور زلف را بگذاشتہ	مہرِ تابان در تہہِ ابرِ سیہ محجوب شد
دلبرم دیدہ بزودی آستیں بر در کشید	چشمۂ خورشید نا گہ از نظر محجوب شد (۱۴)

محبوب کا چہرہ لالہ کے پھول کے مانند سرخ نقاب میں چھپا ہوا ہے۔ جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ آفتاب شفق میں گم ہو گیا ہے۔ جس طرح آفتاب غروب ہونے کے وقت آسمان میں لالی چھا جاتی ہے، جسے شفق کہتے ہیں۔ کیونکہ محبوب سرخ نقاب میں چھپا ہے اسلئے آفتاب نے شفق کی لالی کا نقاب اوڑھ لی ہے۔ گویا محبوب کا روشن چہرہ آفتاب عالمتاب کا مظہر ہے جس سے تمام عالم روشن ہے۔ یہاں شاعر نے سرخ نقاب کو شفق سے اور محبوب کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے۔ میرے محبوب نے رخ انور پر زلف کیا بکھیری ایسا لگتا ہے جیسے دمکتا آفتاب کالے بادل کی اوٹ میں چھپ گیا ہے۔ محبوب کے روشن چہرے پر زلف کا بکھرنا تہہ دار بادلوں کی مانند ہے جس سے بادلوں کی تہہ سے آفتاب کا چھپنا اور نکلنا گمان ہوتا ہے اسی طرح محبوب کے چہرے کی جھلک زلفوں کی چھاؤں سے دکھائی دیتی ہے۔ مجھے

دیکھتے ہی محبوب نے اپنا چہرہ آستین سے ڈھک لیا گویا چشمۂ خورشید اچانک نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔شاعر نے آفتاب سے مسلسل نکلنے والی روشنی کو چشمہ سے تشبیہ دی ہے۔جس طرح چشمہ سے پانی کا جاری وساری ہونا مسلسل ہے۔اسی طرح شاعر کی نگاہوں سے محبوب کا دیدار مسلسل ہے جو آستین کے بیچ میں حائل ہوجانے سے ایسا لگتا ہے جیسے روشنی بکھیرنے والے محبوب کی صورت اچانک آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ہو۔

دانه ہای خال و دامِ زلفِ پیچان دیده ام طائرِ دل را درو پابند حیران دیده ام

نیز از مژگان و ابرو تیرہا اندر کمان بہرِ قتلِ عالمی ہر سوی پران دیده ام (۱۵)

شاعر نے دل کو اس پرندے کی مانند تصور کیا ہے جو جال کے نیچے کے دانے کو تو دیکھتا ہے لیکن جال میں پھنس جانے کی کیفیت سے ناواقف ہوکر دانوں کی ہوس میں جال کا شکار ہوجاتا ہے۔محبوب کی زلفیں ایسا ہی ایک خوبصورت جال ہے جس کے زیرسایہ محبوب کے رخسار پر ایک کالا تل دانے کا کام کررہا ہے۔عاشق کا طائر دل محبوب کے خوبصورت تل پر نظر ڈالتے ہی اس کی زلف پیچان میں قید ہو جاتا ہے گویا عاشق ہوجاتا ہے۔معشوق کی ستم ظریفی یہیں تک محدود نہیں وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مژگان کو تیر سے تشبیہ دیتے ہوئے کمان کی مانند ابرو کو کمان سمجھا ہے۔جس سے معشوق تمام دنیا کو اپنا شکار بنانا چاہتا ہے۔جس کے تیر شاعر ہر طرف اڑتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

چیست گو آن چہره و ابروی جانان آمده بدر شعبان و ہلالِ عیدِ رمضان آمده

خال بر ابروی او دیدم بدل گفتم که واه بر ہلال ایں طرفه تر نجمِ درخشاں آمده (۱۶)

کیا بتاؤں کہ محبوب کے چہرے اور ابرو کی کیا شکل ہے۔ایسا جان پڑتا ہے کہ ماہ شعبان کا کامل چاند ہے یا ہلال عید ہے۔اس کی بھوؤں کے اوپر تل کو دیکھ کر میں نے اپنے جی میں کہا بہت خوب، ہلال پر یہ ایک انوکھا ستارہ چمک رہا ہے۔ یہاں شاعر نے محبوب کے چہرے کو شعبان کے چاند سے تشبیہ دی ہے۔جس طرح شعبان کا چاند شب برأت میں کامل اور اس کی چاندنی پورے شباب پر ہوتی ہے۔ اسی طرح محبوب کے چہرے کی خوبصورتی میں نکھار پورے شباب کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ساتھ ہی محبوب کے ابروؤں کا بانکپن عید کا چاند معلوم پڑتا ہے۔مزید یہ کہ ابروؤں کے اوپر تل ایسا لگ رہا ہے جیسے چاند کے اوپر کوئی انوکھا ستارہ چمک رہا ہو۔شاعر کا دل محبوب کے بدر کامل جیسی صورت اور عید کے چاند جیسے ابروؤں اور انوکھا ستارہ جیسے تل کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ایسے ہی نادر تشبیہات اور استعارات سے شاعر نے جمال یار کی توصیف نہایت دلکش انداز میں کیے ہیں۔

حبذا در باغِ خوبی بہرِ زیبائی حسن　　قامتِ او سرو دلجوی خراماں آمدہ

پیش روی آں حسین جملہ حسینانِ جہاں　　چوں بشمع افرختہ پروانہ حیراں آمدہ(۱۷)

ایک بہترین باغ میں اپنے حُسن کی نمایش کی خاطر محبوب کی قامت ایسی ہے گویا ایک دلکش سرو ہے جو خراماں خراماں ٹہل رہا ہے۔اس حسین محبوب کے سامنے تمام حسینان جہاں کی حیثیت ایسی ہے جیسے روشن چراغ کے گرد پروانے حیران و پریشان طواف کررہے ہوں۔ یہاں شاعر نے محبوب کے قد کو سرو سے تشبیہ دی ہے۔رسؔوا اپنے عاشقانہ جذبات واحساسات کا اظہار کرتے ہوئے محبوب کے مختلف اعضاء کی توصیف میں جو تشبیہات واستعارات اور کنایات کا استعمال جس نئے انداز سے بیان کرتے ہیں وہ بہت ہی قابل رشک ہے۔ اس سے زورکلام اور ندرت بیان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔برق دنداں،لعل خنداں، تیغ ابر، تیر مژگان،خم گیسو،زلف پیچاں، ماہ تاباں،مہر درخشاں، سلک گوہر، رنگ مرجاں، دست رقصاں، پای کوباں،چشم گریاں، سینہ بریاں، دل پریشاں، جان ہراساں،جسم لرزاں، بار ہجراں، پاس جاناں اور بیم رقیباں جیسے استعارات وتشبیہات سے کلام میں انوکھی چاشنی اور دلکشی پیدا ہوجاتی ہے۔

ساخت روشن دیدہ را رخسارِ تابان یك طرف　　برق دندان یك طرف ہم لعلِ خندان یك طرف

جان و دل را خستہ کرد و صبر و ہوشم را بکشت　　تیغِ ابرو یك طرف ہم تیغ مژگاں یك طرف

مرغِ دل را یك بیك از دانۂ پابند کرد　　خم گیسو یك طرف ہم زلفِ پیچان یك طرف

ماہِ من از پردہ بیروں گشت و گردیدہ خجل　　ماہِ تاباں یك طرف مہرِ درخشان یك طرف

از لب و دندانِ یارِ نازنیں بی آب ہست　　سلکِ گوہر یك طرف ہم رنگِ مرجان یك طرف

در جلوی یار ہر سو می دوم دیوانہ وار　　دستِ رقصاں یك طرف ہم پای کوبان یك طرف (۱۸)

مندرجہ بالا غزل کے اشعار میں شاعر نے پہلے مصرعہ میں ایک دعویٰ کیا ہے اور دوسرے مصرے میں اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے دو اشیاء پر اسی کے اثرات کا ثبت ہونا موزوں کیا ہے وہ کہتا ہے کہ پہلے اس نے دمکتے ہوئے رخساروں اور پرنور آنکھوں سے ایک ایسا منظر بنایا کہ اس کے مسکرانے سے چمکتے ہوئے دندان نے بجلی گرنے کا انداز پیدا کیا تو دوسری طرف یہ محسوس ہوا کہ جیسے لعل وگہر لٹ رہے ہیں۔بجلی کی سی چمک والی دانتوں سے محبوب کا حُسن دوبالا ہے۔اس کے ابروؤں کی تلوار اور پلکوں کی تیر سے میں انتہائی زخمی ہوگیا ہوں۔میرے صبر وہوش کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔اپنے الجھے بالوں کو جال کے مانند بچھا کر اس کے نیچے زلفوں کے خم کا دانہ ڈال کر میرے دل کے پرندے کو قید کرلیا۔میرا محبوب حجاب سے باہر کیا آیا؟ چمکتا سورج اور دمکتا چاند شرم کے مارے پانی پانی ہوگیا۔موتیوں کی لڑی کا آب وتاب اور مونگے کے رنگ کی چمک دمک میرے محبوب کے ہونٹوں اور دانتوں سے وابستہ ہے۔اس کے بغیر اس کی چمک دمک پھیکی ہے یعنی بے آب ہے۔پھر کیوں نہ میں لرزتے ہاتھوں اور لڑکھڑاتے قدموں سے جلوہ یار کی خاطر دیوانوں کی طرح ہر طرف

مارامارا پھروں۔

فارسی ادب میں ایسی غزلیں بہت کم ملتی ہیں جن کے ہر شعر میں تشبیہات کا ایسا التزام رکھا گیا ہو جس کی گواہی خود ردیف دے رہی ہو اور اس ردیف کی تکرار بھی مصرعہ کے پہلے جز میں موجود ہو۔ رسؔوا کی مندرجہ بالا غزل اسی ساخت کی ایک ایسی خوبصورت غزل ہے جس میں ''یک طرف'' جہاں ردیف کا مزہ دے رہی ہے وہیں یہی ''یک طرف'' ردیف کے الفاظ پر ہر شعر کے دوسرے مصرعہ کے پہلے جز میں ایک انوکھی کھنک پیدا کر رہے ہیں۔ جس سے شعر کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ تقریباً ہر شعر میں لف ونشر اور رعایت لفظی جیسی صنعتوں کا حسن دلکش معنوی احساسات کا مرقع بن جاتا ہے۔ جو ہر جمالیاتی حس رکھنے والے قاری کے ذہن کو تازگی بخشتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔نسخہ خطی، ص ۵ ،۲۔ایضاً ، ص ۱، ۳،۴۔ایضاً، ص ۱۱، ۵۔ایضاً، ص ۱۲، ۶۔کلیات سعدی، تصحیح شدہ محمد علی فروغی، ذکاء الملک، مطبوعہ سازمان انتشارات جاویدان، تہران۔ص ۸۲۴، ۷۔دیوان حافظ مترجم مولانا قاضی سجاد حسین، ناشر سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ص ۳۳۹، ۸۔ایضاً، ص ۱۵۹، ۹۔ایضاً، ص ۱۲۲، ۱۰۔دیوان کامل امیر خسرو دہلوی، مرتبہ سعید نفیسی، مطبوعہ سازمان انتشارات جاویدان، تہران، سال اشاعت ۱۳۴۱ھ۔ص ۳۱۹، ۱۱۔ایضاً، ص ۲۴۱، ۱۲۔نسخہ خطی، ص ۱۹، ۱۳۔ایضاً، ص ۲۰، ۱۴۔ایضاً، ص ۱۲، ۱۵۔ایضاً، ص ۱۶، ۱۶، ۱۷۔ایضاً، ص ۲۱، ۱۸۔ایضاً، ص ۱۴

☆☆☆

شیخ محمد ارشد جون پوری شخصیت اور شاعری

ارمان احمد، ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

شیخ محمد ارشد جونپوری اپنے دور کے جید عالم، شیخ کامل اور فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ کا خاندان علم وعرفان کا گہوارہ تھا۔ آپ بانی خانقاہ ''رشیدیہ'' جونپور حضرت شیخ محمد رشید مصطفےٰ عثمانی معروف بہ ''دیوان جی'' کے منجھلے صاحبزادے اور جانشین تھے۔ آپ نسلاً عثمانی تھے۔ آپ کی ولادت ۱۰۴۱ھ میں ہوئی تھی۔ آپ کا نام محمد ارشد کنیت ابوالکشف اور لقب بدرالحق تھا۔ مریدین ومتوسلین سلسلۂ رشیدیہ کے نزدیک آپ ''دیوان صاحب'' کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے علوم شرعیہ شیخ عبدالشکور منیری، مولانا الہداد جونپوری، مولانا نورالدین مداری جونپوری، اپنے حقیقی چچا شیخ محمد ولیداور استاذالعلماء شیخ محمد افضل جونپوری سے حاصل کی۔ کچھ کتابیں خصوصاً کتب تصوف والد سے بھی پڑھی۔ ۲۱ سال کی عمر میں علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ ہوکر طالبان علوم نبویہ کو درس دینے لگے۔

۲۲ سال کی عمر میں اپنے والد قطب الاقطاب شیخ محمد رشید کے دست مبارک پر سلسلہ چشتیہ احمدیہ میں بیعت ہوے اور اجازت وخلافت حاصل کی۔ آپ نے دوسرے سبھی خاندانی سلسلوں چشتیہ، چشتیہ طیبیہ، قادریہ شمشیہ، قلندریہ، سہروردیہ وغیرہ کی اجازت وخلافت بھی والد سے حاصل کی۔ آپ اپنے والد کی طرح جواں مرد اور باہمت تھے۔ خاندانی نعمتوں کے حصول کے بعد بھی مزید کوشش جاری رکھی۔ شیخ عبداللطیف مٹھن پوری جو آپ کے خسر اور سیدالطائفہ حضرت جنید بغدادی کی اولاد سے تھے، سلسلہ جنیدیہ اور سلسلہ چشتیہ اشرفیہ میں صاحب اجازت وخلافت تھے۔ آپ نے ان سے دونوں سلسلوں کی اجازت وخلافت حاصل کی۔

آپکو اکثر اولیا کے مزاروں کی زیارت اور علما حق سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔

''ایک مرتبہ جونپور سے اجمیر شریف کا سفر فرمایا تھا درمیان میں جس قدر مشہور ومتبرک مقامات ہیں سب کی زیارت کرتے ہوے وہاں گے۔ جب خواجہ غریب نواز کی زیارت سے مشرف ہو چکے تو دلی آئے اور قطب صاحب اور سلطان المشائخ اور شیخ عبدالعزیز جونپوری ثم دہلوی ودیگر بزرگان کاملین کے مزاروں کی زیارت کی پھر وہیں میر سید حسن رسول نما سے ملے''۔

(میر سید حسن رسول نما ۱۱۰۳ھ متوفی اپنے دور کے جید عالم اور سلسلہ قادریہ کے مشائخ گزرے ہیں۔ اکثر درسی کتابیں حضرت شیخ محمد رشید (۱۰۰۰-۱۰۸۳) سے پڑھی تھیں۔ اپنے مریدوں کو پہلے دن ہی زیارت نبوی سے مشرف کرادیتے تھے۔)

دلی کے سفر میں جاتے یا آتے جب حضرت بدرالحق (شیخ محمد ارشد) نواح لکھنؤ میں بانسہ شریف کے قریب پہنچے ہیں تو حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی قدس سرہ نے فرمایا کہ اس نواح میں ایک عاشق اللہ پہنچا ہے اور حضرت بدرالحق محمد ارشد نے بھی اپنے ساتھیوں سے شاہ صاحب کے حق میں فرمایا کہ ان قصبات سے خدا کے دوست کی بوآرہی ہے۔ آپ ولی کامل اور قطب الاقطاب شیخ محمد رشید مصطفےٰ عثمانی کے قابل فخر فرزند اور جانشین تھے۔ ایک دفعہ پٹنہ میں کسی بزرگ نے حضرت قطب الاقطاب سے پوچھا کہ دوست

جب دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ ہدیہ لے کر جاتا ہے۔آپ جب خدا کے پاس جائیں گے،اگر خدا نے پوچھا میرے واسطے کیا ہدیہ لائے ہو؟ تو کیا جواب دیں گے؟اس پرآپ آبدیدہ ہوے اور فرمایا''دست محمدارشد گرفتہ پیش خواہم کرد کہ ہمیں راہدیہ آوردہ ام''۔

آپ فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔والہؔ تخلص رکھتے تھے۔زیادہ کلام نہیں مل پایا ہے۔''گنج ارشدی''اور بیاض میں کچھ کلام درج ہے۔ڈاکٹر ڈی این چترویدی زاہدؔ''تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ''میں لکھتے ہیں''آپ کا کلام گنج ارشدی میں انتخاب کے طور پر درج ہے۔آپ کی تصانیف تصوف کی مٹھاس سے بھری ہوئی ہے۔ادبی نقطہ نظر سے بھی ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔''

روئے تو آفتاب را رشک است　　موئے تو مشک ناب را رشک است
مردمک ہر کہ دید شدمت ہوش　　کیف چشمت شراب رارشک است
تاتو جا کردئی بہ دہدئہ من　　آب چشم گلاب رارشک است
آب وآتش ترا است اے والہؔ　　شورش تو کباب را رشک است

''گنج ارشدی میں انتخاب کے طور پر جس قدر کلام مندرج ہیں ان کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلام آپ کا مرتب تھا۔جس سے انتخاب کیا گیا۔

یارت لب اوچہ کام دارد　　کو شربتِ مے مدام دارد
قتال شدن و مست بودن　　چشم سہت دوام دارد
بالای بلندت اے دلا رام　　درجان چو الف قیام دارد
دل بردن وبے حزر نشستن　　در شکر تو کدام دارد
ہر کس کے رخ تو دید روزے　　ہمچنوں مہ وخور غلام دارد

ڈاکٹر ڈی این چترویدی آگے لکھتے ہیں۔ایک دوسرا نسخہ خانقاہ رشیدیہ کے کتب خانہ سے حاصل ہوا ہے۔جس کا نام''جام متفرقہ''ہے۔یہ قلمی نسخہ فارسی رسم الخط میں ہے۔اس پر جلد ۱۸ لکھا ہوا ہے۔اس نسخہ میں بھی فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا استعمال ہے۔ اپنی کتاب''تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ''میں ڈاکٹر صاحب نے اس نسخے کے ایک صفحہ کا عکس بھی دیا ہے۔جس میں یہ اشعار بھی ہیں۔

رخ او بے نقاب باید دید　　روز را آفتاب باید دید
لب لعل تو با پیالہ مدام　　مست را شراب باید دید
آہوئے چشم تو گریزاں است　　دحش را در حجاب باید دید

جو شب کنت پیچ در پیچ زلف　　　ما در پیچ و تاب باید دید

حضرت بدرالحق محمد ارشد جمادی الاولی ۱۱۳۱ھ کی تیس تاریخ کو تپ کے عارضہ میں مبتلا ہوے۔ جمادی الاخر کی تیسری تاریخ تک آپ نے جماعت کے ساتھ نماز ادا کی مگر روز بروز تپ کو ترقی رہی۔ دوران مرض ایک روز مولانا جمیل (متوفی ۱۱۲۳ھ) نے آپ سے حال پوچھا۔ آپ نے یہ شعر پڑھا:۔

دل بعشق آں پری پیکر نمیدانم چه شد　　　درد سر باقی بجائو سر نمیدانم چه شد

ای که میگویی چرا آشفته خاطر گشتئه　　　دل بزلفش بسته ام دیگر نمیدانم چه شد

مرض نے جب زیادہ زور پکڑا تو طاقت بالکل سلب ہوگئی اور نشست و برخاست کی قوت نہ رہی۔ مگر جب نماز کا وقت آتا آپ کو افاقہ ہو جاتا اور مصلے پر نماز ادا کرتے پھر بے ہوش ہو جاتے۔ اس بیماری کے زمانے میں آپ نے ایک دن نماز عصر کا تحریمہ باندھا دیکھنے والوں کی نظروں میں کل ارکان ادا نہ ہوے۔ اس وقت آپ کے پوتے اور جانشین حضرت شیخ قمرالحق غلام رشید قدس سرہ رونے لگے۔ لوگوں نے جب تسکین دی تو فرمایا کہ جس ولی کی نماز میں دنیا میں فرق آجاے وہ ولی پھر دنیا میں نہیں رہتا ہے۔ جمادی الاخر ۱۱۳۱ھ کی چوبیسویں شب کو جب ایک پہر رات باقی تھی آپ نے کلمہ طیبہ پڑھا اور رشد و ہدایت کا یہ نیر تاباں ہمیشہ کے لیے آسمان دنیا سے غروب ہوگیا اور اپنے محبوب حقیقی سے جاملا۔ نماز جنازہ مولانا جمیل نے پڑھائی۔ حضرت شیخ محمد رشید مصطفٰے عثمانی کے پائیتیں رشید آباد جونپور میں مدفون ہوے۔

مراجع و مصادر:۔

(۱) الاحسان (مجلّہ)، حسن سعید صفوی (مدیر)، شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد، مارچ ۲۰۱۲ء۔
(۲) تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ، ڈاکٹر ڈی این چترویدی زاہد، ڈاکٹر ڈی این چترویدی زاہد پرمنداپور، بلیا، یوپی، ۱۹۹۴ء۔
(۳) سمات الاخیار، مولوی عبدالحمید کاتب، محمد احسان الحق، الکلیل المطابع بہرائچ، یوپی، ۱۳۴۴ھ۔

☆☆☆

بیداری ایران اور بیسویں صدی کا جدید فارسی ادب

سعدیہ جعفری، ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی وفارسی، الہ آباد، الہ آباد

قصۂ قیس و غصۂ لیلیٰ　　حرف محمود و سر گذشت ایاز
کہنہ شد ایں فسانہ ہا یکسر　　کن حدیث نوی ز سر آغاز
بگذر ازیں فسون و ایں نیرنگ　　دیگر ازیں سخن فسانہ مساز

انیسویں صدی کے آخر میں ایشیا کے بیشتر مما لک میں مغربی سامراج اور شاہی مطلق العنانی کے خلاف تحریکیں آغاز ہو چکی تھیں ایران بھی ان سے الگ نہ رہ سکا، ایران میں انقلابی تحریک نے زور پکڑنا شروع کیا اور شاہ کی مطلق العنانی اور مغرب کی استحصالی کارروائیوں کے خلاف آواز احتجاج بلند کی۔ ۱۹۰۶ء میں ایرانی مظفرالدین شاہ سے اپنی مانگیں منوانے میں کامیاب ہو گئے اور ایران میں مشروطہ یعنی آئینی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اس انقلابی تحریک میں فارسی شعروادب کا زبردست حصہ رہا ہے۔ جدید فارسی شعروادب کی ابتداء اسی دور سے ہوتی ہے۔ اس ادب کی تخلیق میں سیاسی بیداری اور مغربی اثرات نمایاں طور پر کارفرما رہے۔ ۱۹۰۶ء کی سیاسی تبدیلی سے شاہ کو کافی دھکا لگا بادشاہت تو قائم رہی لیکن بادشاہ کے اختیارات میں کمی آ گئی۔ اس تبدیلی کی وجہ سے قومیت کا احساس شدید تر ہوتا گیا جس کی بدولت ''عام انسان'' کا تصور وجود میں آیا اور فرد کی جگہ سماج نے لے لی۔ ان بدلتے ہوئے حالات میں شاعر اور ادیب کو نئے تقاضوں کو پورا کرنا تھا اور یقیناً روایتی ادب اور روایتی شاعری انہیں پورا نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا لازم تھا کہ ادب میں تبدیلی لانے کے لئے اسے ایسے اقدار سے روشناس کرایا جائے جس میں سماج کی بھرپور عکاسی کرنے کی صلاحیت ہو، رعایا قاچاری خاندان کے حکمرانوں کے ظلم وستم سے پریشان تھی لہٰذا جا بجا احتجاج اور بغاوت کی آواز اٹھتی رہتی۔ ایران کی سیاسی بیداری میں جن افراد نے حصہ لیا ان میں سید جمال الدین افغانی اور میرزا ملکم خان کے نام قابل ذکر ہیں ان دونوں کی تعلیمات نے ایرانی ذہن پر گہرا اثر ڈالا اور قانون وآزادی کا مطالبہ عام کرنے میں مدد دی، جمال الدین افغانی کو ایران کی جدوجہد کا بانی خیال کیا جا سکتا ہے۔ جدید فارسی ادب کو انقلابی قدروں سے آشنا کرانے میں جن شعراء اور ادباء نے حصہ لیا ان میں بہار، عارف قزوینی، پورداور علی اکبر دہخدا، نیما یوشیج، صادق ہدایت، مہدی حمیدی اور لاہوتی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں، ان لوگوں نے اپنے اشعار اور نگارشات کے ذریعہ عوام میں بیداری کے صور پھونکے، ان شعراء اور ادباء کو آج بھی ایرانی بھولے نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی تصانیف اور شاعری کو سیاسی اور سماجی تنقید کا وسیلہ بنایا۔ لہٰذا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف اول کا جدید فارسی ادب اپنے عہد کے ان تمام سیاسی معاشی، ثقافتی تحولات اور مدوجزر کا نمائندہ ہے۔ اس مقالے میں میں نہایت اختصار سے ان کا ذکر کرنا چاہوں گی، جنہوں نے ایران کی بیداری میں کارہائے نمایاں انجام دے۔

بہار مشہدی:۔ بہار کی شاعری میں سیاسی اور سماجی رنگ غالب ہے جس سے خرابی ماحول کے خلاف ان کے احساسات کا پتہ چلتا ہے۔ ان

کے رجحان کی نمایندگی کرنے والی نظموں میں ''دماوندیہ'' اور ''چغد جنگ'' موضوع اور بیان کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں۔

ابو القاسم لاہوتی:۔ صف اول کے جدید شعراء میں دوسرا نام لاہوتی کا لیا جا سکتا ہے وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے اشتراکی خیالات کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ ان کی بیشتر نظموں میں اس زمانے کے مظالم کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

میرزا محمد فرخی:۔ انہوں نے غزل کو سیاسی اور سماجی تنقید کا وسیلہ بنایا، قیام مشروطیت کے بعد ان کے انتہا پسند سیاسی عقائد نے انہیں حکومت کے مخالفین میں شامل کر دیا۔ فرخی نے ۱۹۲۱ء میں ایک اخبار ''طوفان'' کے نام سے شائع کیا جسے فارسی کے بہترین جرائد میں شامل کیا جاتا ہے لیکن حکومت کی اس پر سخت نظر تھی اور یہ پندرہ مرتبہ نکلا اور بند ہوا۔ فرخی کی شاعری میں ایران کی موجودہ حالت پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ ظلم و تشدد کی نشاندہی کی ہے۔ جوان کے ہم وطن برداشت کرتے چلے آرہے تھے انہوں نے صاف لفظوں میں اپنی شاعری میں آزادی اور انقلاب کا تصور پیش کیا ہے۔

ابو القاسم عارف:۔ ابوالقاسم عارف نے بھی غزل کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا اور اس رجحان کو مقبول عام بنانے میں اہم خدمات انجام دیں۔ ان کے کلام میں حب الوطنی کا جذبہ نمایاں طور پر کارفرما ہے۔ وہ اس قوم پرستی کے احساس اور جذبے کو پیش کرتے ہیں جسے ایران کی انقلابی تحریک نے جنم دیا تھا۔ ان کی تحریروں کا دوسرا پہلو سیاسی اور سماجی حالات کا تنقیدی جائزہ ہے، جس میں حکمرانوں، وطن فروشوں اور رجعت پرستوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں۔ غزل کے ساتھ عارف نے تصنیف (Ballads) کی طرف خاص توجہ کی ان کو وہ عام جلسوں میں خود گا کر سناتے تھے۔ تصنیف عام شاعری کی ایک قسم تھی جسے ادب میں شمار نہیں کیا جاتا تھا لیکن عارف نے اسے ادب میں جگہ دی۔

عشقی:۔ عشقی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے جدید فارسی شاعری کو ایک نیا آہنگ دینے کی کوشش کی یہ حقیقت ہے کہ ہمعصروں کے مقابلے میں عشقی کا تخلیقی سرمایہ بہت کم ہے اور جتنا ہے وہ بھی معیاری اعتبار سے یکساں نہیں ہے لیکن ان کی کچھ نظمیں بہت معیاری ہیں ''ایدہ آل عشقی'' کا شمار بہترین نظموں میں ہوتا ہے جسے ان کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ اس میں مشہور نظم ''رستاخیز'' ہے جو ماضی کی عظمت اور موجودہ پستی اور سامراجی منصوبوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ عشقی کے کلام میں ملک کی ترقی اور سماج کی اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے وہ صرف حالات پر نکتہ چینی نہیں کرتے بلکہ انہیں بدلنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔

پروین اعتصامی:۔ جن شاعرات نے بیسویں صدی میں اہم مقام حاصل کیا ان میں پروین اعتصامی بھی ہیں۔ ان کی شاعری اخلاقی مضامین کی حامل ہے کہیں کہیں تصوف کی رنگ آمیزی بھی ہے۔ انہیں غریبوں اور ناداروں کا احساس ہے، انہوں نے ایسے اشعار بھی کہیں ہیں جن میں سماجی ظلم و ستم کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

نیما یوشیج:۔ جدید فارسی شاعری کو انقلابی قدروں سے آشنا کرنے میں جن شعراء نے حصہ لیا ان میں سب سے سرگرم نیما یوشیج ہیں انہوں نے ہیئت اور اسلوب کی جدت پر خاص توجہ دی ان کی شاعری میں رسم و رواج کی پابندیوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ نظر آتا ہے،

فارسی میں آزاد اور غیر مقفع نظم کو رواج دینے میں وہ سب سے آگے نظر آتے ہیں ان کی بیشتر نظموں کا موضوع سماج ہے جس کے جور و ستم اور ظلم نا انصافی پر نیما نے اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

ایرانیوں اور قوم پرست شعراء اور ادباء کو جو امیدیں رضا شاہ کے برسر اقتدار آنے سے ہوئی تھیں وہ جلد ہی مایوسی میں تبدیل ہو گئیں اور رضا شاہ نے بھی مطلق العنانی کا راستہ اپنایا اگر چہ انہوں نے ملک میں بہت سی اصلاحات کیں اور ملک کو ترقی دینے میں زبردست رول ادا کیا لیکن چونکہ وہ خارجی سیاست میں اتحادیوں (allies) کے خلاف رہے اسلئے اتحادیوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ تخت سے دست بر دار ہو جائیں آخر کار مجبوراً انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اپنے بیٹے محمد رضا شاہ کو حکومت سونپی، اس زمانہ میں جو شعراء اور ادباء ابھرے ان میں تو للّی، خانلری، نادر نادر پور، فروغ فرخ زاد، بامداد احمد شاملو، علی دشتی، سعید نفیسی وغیرہ ہیں تعلیم کی ترویج سے نئے سائنسی علوم اور مغربی ترجموں کے ساتھ اب خود ایرانی اہل قلم کی اختراعی ذہنی صلاحیتوں نے اظہار کے نئے پیرائے تراشے۔ ترقی پسند سنجیدہ تخلیقی ادب کے لئے اگر چہ فضا سازگار نہیں تھی پھر بھی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی بات اشارے اور کنائے میں کہی، صحافت، ڈرامہ نگاری، افسانہ نویسی اور تبلیغی ادب نے سادہ نویسی کے رجحان کو ترقی دی۔ حسام زادہ، علی شایگان، سعید نفیسی، بدیع الزماں وغیرہ سب جذبۂ حب الوطنی سے سرشار تھے، محمد علی جمال زادہ کی کہانیاں تو گھر گھر سنی جاتی تھیں تقریباً ہر ڈراموں اور کہانیوں میں سماجی اور سیاسی موضوعات کو جگہ دی جاتی تھی۔ پرویز ناتل خانلری شاعر ہونے کے علاوہ ایران کے ادبی حلقوں میں ''سخن'' کے مدیر اور ادبی نقاد کی حیثیت سے مشہور تھے۔

نادر نادر پور کی ذاتی مایوسی، تلخی، درد و غم اور زندگی سے بیزاری بنیادی خصوصیات ہیں جو ان کی نگارشات میں واضح طور پر نمایاں ہیں۔ پہلوی خاندان بھی کم و بیش انہی روایت کا پابند ہو گیا جن پر قاچاری بادشاہ تھے اور محمد رضا شاہ بیرونی ممالک کے اشارے پر چلنے لگے اور مطلق العنانی اختیار کر لی بالآخر امام خمینی کی قیادت میں رعایا نے ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ایک طویل جد و جہد کے بعد ان کی بادشاہت کا خاتمہ ۱۹۷۹ء میں ہو گیا۔ اور جمہوری اسلامی ایران کی بنیاد پڑی اس انقلاب میں بھی ادباء اور شعراء کا گراں قدر حصہ رہا ہے، انقلاب اسلامی کے بعد ادب نے ایک بار پھر انگڑائی لی اور اس میں اسلامی عناصر نے اپنی خاصی جگہ بنالی انقلاب اسلام کے بعد جن شعراء وادباء کا نام سرفہرست ہے ان میں جعفر شہیدی، اسماعیل حاکمی، حداد عادل، رضا براہنی زادفر، اور مجید نفیسی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مختصر یہ کہ بیسویں صدی ایران کے لئے بڑی پر واقعات و حادثات پیہم تغیرات و تحولات اور سخت جد و جہد کی صدی رہی اس نے شروع سے آخر تک زبردست انقلابات کا سامنا کیا اسلئے اگر بیسویں صدی کو ایرانی ادبی اور سیاسی بیداری کی صدی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ حقیقتاً اس میں ایسے شعراء وادباء پیدا ہوئے جنہوں نے پورے سماج کی رہنمائی کی۔ شعر:

ای بسا شاعر که بعد از مرگ زاد　　　چشم خود بر بست و چشم ما گشاد

☆☆☆

فارسی مثنوی نگاری : از خلجیان تا عہد اورنگ زیب ایک جائزہ

محمد توصیف خان کاکر، ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا داخلہ محمود غزنوی سے مانا جاتا ہے مگر اس زبان وادب کو ترقی شہاب الدین غوری کی فتح کے بعد ہندوستان میں قائم ہونے والی مسلم حکومتوں کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ مملوک، البری، خلجی، تغلق، سید، لودی اور مغل کے علاوہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں قائم ہوئیں چھوٹی بڑی سلطنتوں نے فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لئے ہر ممکن کوشش کی، ہندوستان میں فارسی ادب کے ہر میدان مثلاً تاریخ، تذکرہ، لغت، انشاء، تفسیر نیز یہ کہ ہر علوم وفنون پر کئی کئی تصانیف لکھی گئیں۔ مگر سب سے زیادہ جس میدان میں ترقی ہوئی وہ شاعری کا میدان تھا، ہندوستانی سرزمین نے فارسی زبان کے ایسے ایسے شعراء پیدا کئے جن کی شہرتوں کے طوفان نے اصفہان وشیراز کے قصر تک ہلا دئے۔ جیسا کہ فارسی ادب کے ہر میدان میں ہندوستانی سرزمین پر تصنیف وتالیف کا دور چلا اسی طرح فارسی شاعری کی ہر صنف میں یہاں کے شعراء نے بھی خوب طبع آزمائی کی اور فارسی شاعری کو وہ معراج عطا کی کہ خود ایک سبک موسوم بہ ''سبک ہندی'' ایجاد ہوا۔ بہر حال ہم یہاں فارسی شاعری کی ایک آسان مگر جامع، طویل مگر دلکش، داستانی مگر لذت آمیز صنف پر مختصراً تبصرہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

لفظ مثنوی عربی زبان سے مشتق ہے یہ ''اثنین'' سے ماٴخوذ ہے جس کے معنی دو کے ہیں چونکہ مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور پوری نظم میں یہی سلسلہ برقرار رہتا ہے اس لئے اسے مثنوی کہا گیا مثنویوں میں اشعار کی تعداد متعین نہیں ہے اور مثنویوں میں ردیف کا استعمال نہیں ہوتا۔ مثنویاں عام طور پر چھوٹی بحروں میں ہوتی ہیں اور ان کے لئے کچھ بحریں مخصوص ہیں ان کی پیروی کے بغیر ایک مقبول مثنوی کو وجود میں لانا ذرا مشکل امر ہے حالاں کہ کچھ نئی بحروں کا استعمال صوفی حضرت امیر خسرو دہلوی نے کیا ہے جو کہ خسرو جیسی شخصیت ہی کر سکتی ہے اور ایسا کرنا اور کسی کی دسترس میں نہیں۔ جن بحروں کو مثنوی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ ان مخصوص بحروں کے علاوہ کسی دوسری بحر میں مثنوی نہیں کہہ سکتے لیکن چونکہ ان بحروں کو استادوں نے استعمال کیا ہے اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہی بحریں مثنوی گوئی کیلئے خاص کر دیا گیا ہے اور ان کا استعمال میں لانا ہر مثنوی نگار پر لازم معلوم ہوتا ہے، بحروں کی ترتیب کچھ یوں ہے۔ بحر ہزج مسدس مقصور ومحذوف اس کے ارکان عروضی یہ ہیں ''مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیل/ فعولن''۔ دوسری بحر ہزج مسدس مقبوض مقصور/ محذوف اس کے ارکان عروضی یہ ہیں ''مفعول، مفاعلن، مفاعیل/ فعولن''۔ تیسری بحر رمل مسدس محذوف اس کے ارکان عروضی ''فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات''۔ چوتھی بحر رمل مسدس مخبون مقصور محذوف اس کے ارکان عروضی ''فاعلاتن، فعلاتن، فعلات / فعلن''۔ پانچویں بحر سریع مطوی موقوف اس کے ارکان عروضی اس طرح ہیں ''مفتعلن، مفتعلن، فاعلات''۔ چھٹی بحر متقارب مثمن محذوف اس کے ارکان عروضی ''فعولن، فعولن، فعولن، فعول/ فعل''۔ ساتویں بحر خفیف مخبون مقصور ارکان عروضی ''فاعلاتن، مفاعلن، فعلن /

فعلات''۔ یہ سات بحریں مثنوی گوئی کے لئے زیادہ مشہور ومعروف ہیں اور مثنوی نگاروں کے یہاں عام ہیں یہ تمام بحریں کثیرالاستعمال ہیں دو بحریں اور ہیں لیکن وہ زیادہ مستعمل نہیں ہیں، مثنوی میں اشعار کی کوئی پابندی نہیں ہے اس کی مثال ہمارے سامنے شاہنامہ کی شکل میں موجود ہے جس کے اشعار کے تعداد ساٹھ ہزار ہیں۔

فارسی مثنویوں کی ابتداء فارسی شاعری سے ہی ہوئی اس کے موجد رودکی سمرقندی ہیں لیکن رودکی سے پہلے سامانی دور میں ابو شکور بلخی کا نام آتا ہے شکور بلخی نے ایک مثنوی لکھی جواب ناپید ہے البتہ اس کی ایک نظم کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے شکور بلخی نے ۳۳۶ھ میں ''آفرین نامہ'' کے عنوان سے لکھی اس پر محققوں کا عام اتفاق ہے کہ ابوشکور بلخی ہی فارسی مثنویوں کا موجد ہے۔ رودکی نے ابن مقفع کی 'کلیلہ ودمنہ' کا فارسی منظوم ترجمہ کیا یہ ہندوستان کی ایک مشہور کتاب 'پنچاتنتر' کا عربی ترجمہ ہے اس میں جانوروں کی زبانی نصیحت آمیز حکایتیں بیان کی گئی ہیں، گردش زمانہ کی وجہ سے رودکی کا یہ کارنامہ محفوظ نہ رہ سکا البتہ اس کے چند اشعار مختلف تذکروں کی زینت ہیں۔ ایران میں فارسی مثنویوں کو کئی شعراء نے لازوال مقام بخشا عنصری کی تین مثنویاں 'شاد بحر وعین الحیات'، 'وامق وعذرا' اور خنگ بت وسرخ بت' حکیم فردوسی طوسی کا عظیم شاہکار 'شاہنامہ فردوسی' نظامی گنجوی نے خمسہ لکھ کر مثنویوں کو ایک نیا رخ دے دیا اس کے بعد مولانہ روم نے 'نی نامہ' جو کہ مثنوی معنوی کے نام سے مشہور ہوئی اس صنف میں چار چاند لگا یا اس کی اہمیت اور بزرگی کی مثال اسے بڑھ کے کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو 'ہست قرآن درزبان پہلوی' کہا گیا ہے۔ ایران میں مثنوی گوئی کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ہم مختصراً چند اہم مثنوی گو شعراء ذکر تے ہیں جنھوں نے مثنوی گوئی کو ایک لازوال مقام بخشا ہے ان اسعدی طوسی، حکیم سنائی، شیخ فریدالدین عطار، خاقانی شیروانی، شیخ سعدی شیرازی اور مولانہ جامی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان میں فارسی مثنویوں کی ابتداء عہد خلجیان سے شروع ہوئی حضرت امیر خسرو نے اولاً مثنوی گوئی کی ابتداء کی اس کے بعد اس صنف نے ہندوستان میں ترقی کے منازل طے کرنے شروع کئے اور تقریباً ہر شاعر نے اس صنف میں اپنے کمالات دکھائے لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ اس صنف ادب نے بھی دم توڑ دیا زبان فارسی کی تنزلی کے ساتھ ہی فارسی مثنویاں بھی زوال پذیر ہونا شروع ہوگئی ہندوستان میں امیر خسرو کی مثنویاں دور غلامان، خلجیان، تغلقان، کی کئی تاریخی پس منظر سے اہم ہے اور کئی طرح کی تاریخی ابواب پے روشنی ڈالتی ہیں اور ان کے رازوں کا انکشاف کرتی ہے۔ امیر خسرو نے کئی مثنویاں تحریر کی جن میں خمسہ خسرو خاصی مشہور ہیں جو کہ نظامی گنجوی کے خمسہ کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔

خمسۂ خسرو : 'مطلع الانوار' خسرو نے مثنوی نظامی ''مخزن الاسرار'' کے جواب میں لکھی اس کے اشعار کی تعداد تقریباً تینتیس سو تک ہے۔ 'شیرین خسرو' مثنوی نظامی ''شیرین خسرو'' کے جواب میں لکھی اس میں اشعار کی تعداد چار ہزار ایک سو چوبیس ہے۔ 'لیلی مجنوں' تیسری مثنوی نظامی کی 'لیلی ومجنوں' کا جواب ہے کل اشعار کی تعداد ۲۶۶۰ ہے۔ 'آئینۂ سکندری' نظامی کے ''اسکندر نامہ'' کا جواب ہے کل تعداد اشعار ۴۴۵۰ ہے۔ 'ہفت بہشت' ''ہفت پیکر'' نظامی کے جواب میں تالیف کی اس کی سن تالیف ۷۰۱ھ ہے۔ جتنے

بھی خمسے لکھے گئے خمسہ نظامی کے جواب میں ان میں اٹھارہ ہزار ابیات پر مشتمل خمسہ امیر خسرو سب سے ممتاز ہے اور ایک الگ حیثیت ومقام کا حامل وحقدار ہے، ان تمام مثنویوں کو حاکم وقت علاء الدین محمد شاہ کے نام معنون کی گئی۔ خمسہ کے علاوہ خسرو نے کئی تاریخی مثنویاں بھی تحریر کئیں خسرو نے بادشاہوں کی سیاسیر وداد کو مثنوی کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا ان کی ادبی قدر و قیمت نا قابل بیان ہے، خسرو کی تاریخی مثنویاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

قرآن السعدین: خسرو کی یہ پہلے تاریخی مثنوی ہے جو کہ خمسہ سے پہلے ۶۸۸ھ وجود میں آئی، اس کا موضوع باپ بیٹوں کی ملاقات پر مبنی ہے خسرو نے کیقباد کی فرمایش پر اس واقعہ کو نظم کیا۔ بلبن نے اپنا جانشین بیٹے بغرا خان کے بجائے پوتے کیقباد کو مقرر کیا، بغرا خان بنگال کا گورنر تھا اور کیقباد دہلی تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا اور عیش وعشرت میں ملوث ہو گیا جب بغرا خان کو یہ پتہ چلا تو اپنے بیٹے کو سمجھانے کی غرض سے دہلی کو روانہ ہوا کیقباد کو مغالطہ ہوا کہ کہیں اس کا باپ اس تخت سلطنت سے محروم نہ کر دے اور کیقباد لشکر لیکر دہلی سے روانہ ہوا دونوں فوجیں لکھنؤ گومتی کے کنارے ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئی، عنقریب تھا کہ جنگ شروع ہو جاتی لیکن ہوشمند اور مدبرین حکومت نے مل کر آپسی اختلافات کو ختم کیا اور صلح کرادی اور چونکہ خسرو اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے اس لئے کیقباد کی فرمائش پر انہون نے اس واقعہ کو نظم کیا قرآن السعدین کا مطلب بھی یہی ہے کہ دو نیک ستاروں کا ایک دوسرے کے قریب ہونا۔

مفتاح الفتوح : یہ دوسری تاریخی مثنوی ہے اس میں جلال الدین خلجی کے بارے میں بیان کرتے ہیں خلجی کی زندگی کے احوال بیان کئے ہیں یہ مثنوی ۱۰۶۷ اشعار پر مشتمل ہے یہ مثنوی ۶۹۵ھ میں مکمل ہوئی۔

دول رانی خضر خان : اس میں علاء الدین خلجی کے بیٹے شہزادہ خضر خان اور گجرات کے راجہ کی بیٹی دول رانی کی عشقیہ داستان بیان کی ہے شہزادے نے خود سے سارے واقعات تحریر کئے اور امیر خسرو کے سامنے پیش کیا اور ان سے فرمایش کی کہ اس کو نظم کر دیں چنانچہ خسرو نے دول رانی خضر خان کے نام سے اس مثنوی کی شکل میں نظم کیا یہ مثنوی ۷۱۵ھ میں تکمیل کو پہنچی۔

نہ سپہر : امیر خسرو نے عہد خلجیان کے آخری سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے حالات بیان کئے ہیں اور چونکہ سلطان عیش پرست تھا اس لئے خسرو نے نوجوان سسلطان کو متوازن زندگی بسر کرنے کی تاکید کرتے ہیں، یہ پوری مثنوی نو ابواب پر مشتمل ہے اس مناسبت سے اس کا نام ''نہ سپہر'' رکھا گیا اور خسرو نے ہر باب کے لئے ایک نئی بحر کا استعمال کیا ہے، مثنوی کا اختتام ۷۱۸ھ میں ہوا۔

تغلق نامہ : یہ خسرو کی آخری تاریخی مثنوی ہے اس میں غیاث الدین تغلق اور خسرو برواری کے درمیان معاملات سلطنت کو بیان کیا گیا ہے اس تاریخی کام کو انجام دینے کے لئے غیاچالدین تغلق نے پیغام کے ذریعہ امیر خسرو کو دربار میں بلایا اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ جس طرح سیسابق سلاطین کے کارناموں کو بذریعہ مثنوی بیان ومحفوظ کرتے آئے ہیں اسی طرح اس کے بھی حالات پر توجہ کریں خسرو نے سلطان کو مایوس نہیں کیا اور ایک بار پھر اپنی شعری صلاحیت کا بہترین مظاہرہ ''تغلق نامہ'' کی شکل میں پیش کیا، یہ مثنوی ۷۲۰ھ میں بزرگ امیر خسرو کے مرہون منت پایہ تکمیل کو پہنچی۔

عہد خلجیان کے ایک اور مشہور عرفانی مثنوی گوشاعر کا وجود ملتا ہے جن کا نام شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی ہے اخلاق ق عرفان سے بھرپور ان کی دو مثنویاں خاصی اہمیت کی حامل ہیں ان میں ''کنز الاسرار'' اور مثنوی بوعلی قلندر قابل ذکر ہیں۔

فتوح السلاطین: امیر خسرو کے ٹھیک بعد ایک اور مثنوی گوشاعر کا وجود نظر آتا ہے جو کہ محمد بن تغلق کا معاصر ہے اصلاً دہلی کا رہنے والا ہے اس کا نام عصامی ہے انھوں نے شیخ نظامی کے کہنے پر ہندوستان میں ترکوں کی فتح پر عصامی نے منظوم داستان نظم کی او ''رفتوح السلاطین'' کے نام سے مشہور ہوئی بحر متقارب مثمن محذوف میں نظم کی اس کو شیخ نظامی کی تاکید پر نظم کیا جو کہ ایک خوب میں عصامی نے دیکھا تھا ''فتوح السلاطین'' میں اشعار کی کل تعداد بارہ ہزار ہیں، یہ مثنوی تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہے اس کو ہم ہندوستان کا شاہنامہ کہہ سکتے ہیں جیسے حکیم فردوسی نے ایران کی تاریخ رقم کر شاہنامہ تحریر کیا اسی طرح عصامی نے ''فتوح السلاطین'' تصنیف کر ہندوستان کی تاریخ سالہا سال کے لئے محفوظ کر دیا یہ مثنوی سلطان محمود غزنوی کے تاریخی احوال سے شروع ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ محمود کے بیٹے مسعود غزنوی کا زوال اور سلجوقی ترکوں کے ہاتھوں اس کی شکست کا واقعہ اس مثنوی میں پوری وضاحت اور مستند تاریخی احوال بیان کئے ہیں، غرض محمود غزنوی سے لیکر محمد بن تغلق تک کے تمام احوال و آثار کو بڑی ہی خوبصورتی سی بیان کیا ہے گویا کہ اس دور کی پوری تاریخ کو عصامی نے ایک مثنوی میں جمع کر دیا ہے اور اس کے اس عظیم شاہکار کی وجہ سے اس کی اتنی پذیرائی نہیں ہوئی جس کا وہ مستحق ہے بہر حال زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عصامی نے غزنویوں سے لیکر غلامان تک کے اکثر و بیشتر تمام واقعات کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس عہد کو اپنی مثنوی کے ذریعہ ہمیشہ ہمیش کے لئے زندہ کر دیا۔ عصامی کے بعد سے مغل حکمراں جلال الدین محمد اکبر تک ہمیں کوئی ایسا مثنوی گوشاعر نظر نہیں آتا جس کا ذکر ہم کرسکیں عہد اکبری سے لیکر آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک کے اس دور نے فارسی شاعری بطور خصوصی مثنوی گوئی کو بہت عروج بخشا اور یہ پورا دور اس کی نشو ونما کے لئے کافی اہم اور سودمند ثابت ہوا لیکن ہاں اس عرصہ دراز میں مثنوی میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہوئی اور وہ یہ کہ مثنوی میں تغزل پیدا ہو گیا، بہر کیف عہد اکبری میں بہت سی مثنویاں لکھی گئی جن میں کچھ یہ ہیں، مرآۃ الکائنات از غزالی مشہدی، کوہ اجمیر از قاسم ارسلان، گل افشان از قاسم کاہی، محمود وایاز از انیسی شاملو، صورت معنوی از پیروی، حسن یاسف از تدروی ابہری، سکندر نامہ از ثنائی، نقش بدیع، رشحات الحیات، آئینہ خیال، مثنوی خنجر بیگ، مثنوی دلفریب از سید شاہی، سوز اگداز اور ساقی نامہ از ملا نوعی خبوشانی، عرفی نے بھی خمسہ کا جواب لکھنا چاہا پر مکمل نہ کر سکا مجمع الافکار اور فرہاد و شیرین اس کی دو مثنویاں ہیں، فیضی نے تقریباً پانچ مثنویاں مرکز ادوار، سلیمان وبلقیس ہفت کشور، اکبر نامہ اور نل دمن لکھی سوائے نل دمن کے اور کوئی مثنوی مکمل نہ ہوسکی۔ ذیل میں ہم چند مشہور مثنویوں کا ذکر کریں گے۔

امیر خسرو کے بعد دربار اکبری سے تعلق رکھنے والا شاعر محمد جمال الدین عرفی پہلا شاعر ہے جس نے خمسہ کا جواب لکھنا شروع کیا تھا لیکن ابھی دو ہی مثنوی لکھا تھا کہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

مجمع الافکار : یہ مثنوی نظامی کی مثنوی ''مخزن الاسرار'' کے جواب میں لکھی اس میں اخلاقیات اور فلسفہ پر بحث کی گئی ہے۔

فرھادو شیرین : یہ مثنوی شیرین وحسرو کے جواب میں لکھی گئی پر اب نا پید ہے اس کے کچھ آ ثار ''مجمع الفصحاء'' جیسے تذکروں میں محفوظ ہیں۔

اس کے بعد ابوالفیض فیضی نے تقریباً ڈھائی سو سال بعد مثنوی میں دوبارہ جان ڈالی اس کا شمار ہندوستان کے عمدہ شاعروں میں ہوتا ہے اسوے دربار سے ملک الشعراء کا بھی خطاب ملا۔اس نے بھی خمسہ کا جواب لکھنا شراع کیا تھا لیکن پوری نہ کرسکا۔

نل دمن: فیضی نے یہ مثنوی لیلیٰ ومجنون کے طرز پر لکھی یہ ایک ہندوستانی عشقیہ داستان ہے نل دمن کی داستان قدیم سنسکرت کی کتابوں سے ماخوذ ہے یہ مثنوی مالوہ کے راجہ 'نل' اور راجہ بھیم کے بیٹی 'دمینتی' کی عشقیہ داستان ہے 'دمن' 'دمینتی' کا مخفف ہے فیضی نے اس داستان کو بڑی ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے اس مثنوی کو دلچسپ بنانے کے لئے فیضی نے جناتوں کے قصوں کو بھی شامل کیا ہے۔اس کی بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور ہے اشعار کی تعداد چار ہزار ہے۔

ساقی نامہ: یہ مثنوی مولانا نوعی خبوشانی کی لکھی ہوئی ہے یہ مثنوی عبدالرحیم خان خاناں کی شان میں کہی گئی اس کے بدلے انہیں کافی انعام واکرام سے نوازہ گیا اس کی تعداد کل ۱۳۲۰ اشعار ہیں۔

سوزو گداز: مولانا نوعی کے قلم کا نتیجہ ہے یہ ایک ہندوستانی عشقیہ داستان پر مبنی ہے اس میں ایک ہندو لڑکا و لڑکی کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے یہ عشقیہ مثنوی پر از سوز وگداز ایک حقیقت پر مبنی ہے جو کہ اکبر کے عہد میں لاہور ہوئی اس کے اشعار کے تعداد پانچ سو ہیں۔

دل فریب : سیدشاہی مصنف کا نام ہے یہ بھی ایک عشقیہ داستان ہے شاہی لشکر کے سپاہی موسیٰ اور موہنی کے عشقی مضمون پر مبنی اس مثنوی کو سیدشاہی نے بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

مثنوی خنجر بیگ: خنجر بیگ اس کا مصنف ہے اس میں بادشاہ اکبر کو سیاسی نصیحتیں دی گئی ہیں یہ ایک طرح کا سیاست نامہ ہے اشعار کی تعداد تین سو ہے۔

ساقی نامہ: ظہوری ترشیزی دکنی نے لکھا یہ ایک خاص قسم کی مثنوی ہے عادل شاہی سلاطین کے دربار سے وابسطہ رہنے کے باوجود ظہوری مثنوی نگاروں کی فہرست میں اپنا ایک بلند مقام پیدا کیا اس میں شاعر خصوصی طور پر ساقی سے خطاب کرتا ہے اس پوری مثنوی میں شاعر کا دھیان شراب اور اس کے جملہ لوازمات کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بخوبی ہوجاتا ہے کہ ظہوری کے بعد کے شعراء اور اس کے ہمعمر شعراء ''ساقی نامہ'' کے میدان میں طبع آزمائی کرتا نظر آتا ہے۔اس کے اشعار کی تعداد چار ہزار ہے۔

عہد جہانگیر میں طالب آملی نے خسروشیرین کی بحر میں ایک مثنوی کہی اس کے علاوہ ، جہانگیر نامہ، قضاوقدر، اور ایک مثنوی وحدانیت الٰہی پر مبنی ہے نیز اس کی چھوٹی چھوٹی متعدد مثنویاں ہیں۔مثنوی دولت بیدار از ملا شیدا، خسروو شیرین از مولانا شکیبی صفاہانی، انداز نامہ اور ساقی نامہ از حکیم عارف ایگی، وغیرہ۔

جہانگیر نامہ: طالب آملی، یہ ایک طویل مثنوی ہے اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور میں موجود ہے اس کے اشعار کی

تعداد ۳۴۷۷ بتائی جاتی ہے۔

رام سیتا: جہانگیر کے عہد کا مثنوی نگار مسیحا پانی پتی اس کا لکھنے والا ہے اس میں 'رامائن' کی داستان کو بیان کیا گیا ہے اس کو بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے، کئی ہندو شعراء نے رام سیتا کی داستان کو نظم کیا ہے لیکن جو مقام ادبی فصاحت اور اسلوب بیان کی دلکشی میں مسیحا پانی پتی کی مثنوی کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں۔

انداز نامہ: حکیم عارف ا یگی، یہ ایک طویل مثنوی ہے جو کہ شاہنامہ کی بحر میں ہے اس میں اشعار کی تعداد تقریباً ۲۳۰۰ ہے۔

دور شاہجہانی میں بہت سے عمدہ ادباء و شعراء پیدا ہوئے ہر صنف ادب پر شعراء وادباء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن افسوس وہیں مثنوی کے میدان میں بہت کم لوگوں نے قلم اٹھائے ان میں چند یہ ہیں بادشاہ نامہ، قندھار نامہ، محمود وایاز، ازکلیم کاشانی اور کلیم نے برج ثمن، قحط دکن، صعوبت دکن پر بھی مثنویاں لکھی، ظفر نامہ شاہجہانی از قدسی مشہدی، جلوۂ ناز، مثنوی مے خانۂ ناز، مثنوی میخانۂ راز اور کشمیر پر ایک مثنوی لکھی جس کا نام ہفت منزل ہے از ظفر خان احسن، ملا حسن فانی کی چار مثنویاں مصدرالاسرار، ناز و نیاز، ماہ ومہر، اورہفت اختر یہ خمسہ کے جواب میں ہیں پر چار ہی ہیں، ساعی کی متعدد مثنویاں جن کے نام نامعلوم ہیں اور تحقیق طلب ساعی کی چند مثنویاں یہ ہیں ساقی نامہ، غم دل، پری پیکر، وغیرہ اس کے علاوہ جنگ نامۂ اسلام خان از سلیم طہرانی وغیرہ خاصے مشہور ہیں۔ ان میں سے چند مشہور مثنویوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

بادشاہ نامہ: ازکلیم کاشانی، یہ شاہجہان کی منظوم تاریخ ہے شاہی فتوحات کا بھی ذکر کیا، لیکن یہ مثنوی پوری نہ ہوسکی صرف ابتدائی دس سال کی تاریخ بیان کر پایا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا یہ ایک طویل نظم ہے کل اشعار کی تعداد پندرہ ہزار ہیں۔

ظفر نامہ شاھجھانی: حاجی محمد جان قدسی مشہدی اس کا لکھنے والا، اور تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے کشمیر کی تعریف کی ہے۔

ساقی نامہ: مثنوی نگار ساعی ہے اس مثنوی کی تکمیل ۱۰۶۷ھ میں ہوئی اس میں شاہجہان اور اس کے بیٹے شاہ شجاع دونوں کی خوب مدح کی گئی ہے۔ ابیات کی تعداد ۷۴۳ ہے۔ ساعی کے دیوان میں کئی مثنویاں درج ہیں لیکن ان میں اکثر کا نام معلوم نہیں اس لئے ان کے مضمون کے بارے میں کچھ اطلاعات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کی ایک مثنوی جسکا عنوان نامعلوم ہے لیکن اس میں 'مدھو مالتی' کی داستان بیان کی گئی نیز کردار کے حسن و جمال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک مثنوی اور ہے جس کا عنوان نامعلوم ہے اس میں ایک ہندو عورت کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے یہ ایک تمثیلی مثنوی ہے۔ ایک اور مثنوی جو اورنگ زیب کی تعریف میں بیان کی گئی ہے۔

مغلیہ سلطنت کے عہد اورنگ زیب میں مثنویوں کو جو عروج ملا وہ قابل ذکر ہے عہد اورنگ زیب میں اس صنف ادب کو لازوال مقام بخشا اور شاید کہ جتنا کام اس دور میں ہوا آج تک نہ ہوا ہندوستان میں مثنوی گوئی کے اعتبار سے یہ ایک سنہرا دور تھا اس میں کئی ایسے مثنوی گو شعراء ہوئے جنہوں نے اس صنف کو دوام بخشا، اس دور کی مثنویوں کی فہرست کچھ یوں ہے، نعمت خان عالی کی دو مثنویاں سخن عالی اور شاہنامہ گورگان، عاقل خان رازی کی مثنویاں، پدماوت کا منظوم فارسی ترجمہ 'شمع و پروانہ'، منوہر و مدھو مالتی، یا 'مہر و ماہ' اور

مثنوی مرقع مثنوی معنوی کی بحر میں۔ قضاوقدر راز ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی اس میں سات سو اشعار ہیں اورنگ زیب کی مدح میں بھی ایک مثنوی کہی اور تیوہار ہولی پر بھی ایک مثنوی لکھی۔ حملۂ حیدری از رفیع خان باذل۔ 'آئینہ خانہ' اور 'پری خانہ' از حکیم محمد کاظم۔ جامع نشاتین از مرزا محمد علی ماہر اکبرآبادی۔ مثنوی نور علی نور، مثنوی حسن وعشق، مثنوی قضاوقدر، مثنوی در بعض خصوصیات ہند، جنگ نامہ محمد آعظم اور مثنوی در تعریف خس خانہ از محمد افضل سرخوش۔ چار گوہر منیر اور مثنوی در صفت بنگال از منیر لاہوری۔ مثنوی فطرت یا قصۂ بنارس از معزالدین موسوی خان فطرت۔ دادوفریاد از راسخ سرہندی۔ درعروسی فرخ سیر، مثنوی امواج الخیال، مثنوی درعروسی ارشاد خان از میر عبدالجلیل بلگرامی واسطی۔ میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کی مثنویاں، محیط آعظم، طلسم حیرت، طور معرفت، اور عرفان۔ مجموعۂ مثنویات بینش مثنوی بینش ابصار، گنج رواں، جواہر خانہ از بینش کشمیری۔ مثنوی نیرنگ عشق معروف بہ شاہد وعزیز از اکرم غنیمت۔

شاھنامه گورگان: نعمت خان عالی، اورنگ زیب کے فرزند بہادر شاہ اول کی فرمائش پر مغلوں کی منظوم تاریخ لکھی۔

شمع وپروانہ: عاقل خان رازی کی تصنیف ہے یہ ملا محمد جائسی کی ہندی پدماوت کا منظوم فارسی ترجمہ ہے، اس کے دو حصے ہیں ایک ''رتن سین اور پدماوتی کے عشق اور شادی'' اور دسرا ''چتوڑ پر علاء الدین کی یلغار'' نیز رتن سین کی موت اور پدماوت کے ستی ہونے کے بیان پر مبنی ہے۔

حملۂ حیدری: رفیع خان باذل نے لکھی یہ شاہنامہ فردوسی کی طرح ایک طویل مثنوی ہے شاہنامہ کی تقلید میں اس نے یہ مثنوی غزوات نبوی پر لکھی اس کے اشعار کی تعداد مولف مآثر الامراء کے مطابق اشعار کی تعداد چالیس ہزار اور مولف مآثر الکرام کے مطابق نوے ہزار اشعار تھے۔

چار گوھر منیر: منیر لاہوری کی چاروں مثنویوں کو کہا جاتا ہے ان میں آب ورنگ، اس میں خاص کر شہر آگرہ اور وہاں کے باغات کا ذکر کیا گیا ہے، دوسری مثنوی نور وصفا ہے اس میں شاہجہان کے نئے دارالسلطنت کا ے عمارتوں کا حال بیان کیا گیا ہے خصوصی طور پر شاہجہان آباد (دہلی) میں بنی جامع مسجد کا مفصل ذکر کیا ہے۔ تیسری مثنوی 'ساز وبرگ' اس میں پان کی تعریف اور خصوصیت بیان کی گئی ہے نیز دیگر آرایش کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ چوتھی مثنوی ''دردوالم'' یہ مثنوی زمانہ قدیم کے عشقیہ مثنوی نگاروں کے انداز پر لکھی گئی ہیں۔

در عروسی فرخ سیر: یہ مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی کی معرکتہ لآراء تصنیف اور عہد اورنگ زیب کی ممتاز مثنویوں میں سے ایک ہے، یہ مثنوی فرخ سیر کی راجہ اجیت سنگھ کی بیٹی سے شادی کے بعد لکھی گئی۔ اس میں مغلیہ شادیوں کے رسومات، شادی کے جوڑے، کھانے، روشنی اور آتش بازی کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی زبان وادب اور اس وقت کی تہذیب وثقافت دونوں کی آئینہ دار ہے۔

مثنوی عرفان: از مرزا بیدل، یہ مثنوی مولانا روم کی مثنوی معنوی کے بعد عرفان کے موضوع پر سب سے مشہور مثنوی ہے، مثنوی

عرفان پراز فلسفیانہ نکات بیدل کی تمام مثنویوں میں سب سے اہم مثنوی ہے اس کے اشعار کے تعداد گیارہ ہزار ہیں اس مثنوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ غالباً تیس سال میں مکمل ہوئی۔مثنوی عرفان بحر خفیف مخبون میں ہے اس کے ارکان عروضی، فاعلاتن، مفاعلن، فعلات ہے۔

بطور مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں فارسی مثنوی جس کی ابتداء ابوشکور بلخی نے ''آفرین نامہ'' سے کی، اس صنف نے نہ صرف ایران بلکہ ہندوستان میں بھی خوب ترقی حاصل کی مندرجہ بالا سطور میں عہد خلجیان سے عہد اورنگ زیب تک کی مشہور مثنویوں کا تعارف اس امر کا گواہ ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی گئی اور خاص کر مثنوی جیسی صنف کی خوب پذیرائی ہوئی۔

کتابیات:

(۱) عہد خلجیان ہند کی نمائندہ فارسی منثورات۔ڈاکٹر سید اسد علی خورشید۔علیگڑھ۔۲۰۰۷ء،
(۲) فارسی مثنوی کا ارتقاء۔داکٹر عزیز عباس۔نئی دہلی۔۲۰۰۷ء،
(۳) عاقل خاں رازی۔پروفیسر محمد اقبال۔نئی دہلی،
(۴) بزم مملوکیہ۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔اعظم گڑھ۔۲۰۰۹ء،
(۵) بزم تیموریہ (تینوں جلدیں)۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔اعظم گڑھ۔۲۰۰۹ء،
(۶) چکیدہ (حصہ شعر)۔ڈاکٹر منظر امام۔مظفر پور۔بہار،
(۷) مثنوی گوئی بعہد اورنگ زیب۔ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی۔علیگڑھ۔۲۰۱۴ء،
(۸) درس بلاغت، باب ششم۔بحریں اور زحافات۔از شمس الرحمٰن فاروقی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۱۲ء

☆☆☆

جنوبی ہند کی قطب شاہی سلطنت اور اس کے تاریخی آثار

سید عادل احمد، محکمۂ آثار قدیمہ، آندھرا پردیش اسٹیٹ میوزیم، پبلک گارڈن، نامپلی، حیدرآباد۔

دکن کی عظیم الشان بہمنی سلطنت میں محمود گاواں کے قتل کے بعد جو انتشار پیدا ہوا، اس نے سلطنت کو زوال کے راستے پر ڈال دیا۔ بڑے بڑے صوبہ دار اپنی اپنی جاگیروں میں خود مختار ہو گئے اور اس طرح دکن کے خطہ میں پانچ الگ الگ مسلم مملکتیں وجود میں آئیں۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی ہمدانی کو خواص خاں کے اعزاز پر ترقی ملی تھی اور وہ خواص خان سے ترقی کر کے قطب الملک اور تلنگانہ کا جاگیردار بن گیا۔ اس نے چند مواقع پر اپنی جواں مردی اور فطری صلاحیتوں کا خوب اظہار کیا جس سے سلطان شہاب الدین محمود بہمنی بہت متاثر ہوا۔ اس نے اسے تلنگانہ کے دوسرے جاگیرداروں کے ساتھ جیسے جہانگیر خان، سنجر خان اور قوام الملک سے بھی آگے بڑھاتے ہوئے امیر الامراء کا خطاب عطا کیا۔ محمود شاہ کی زندگی کے آخری دور میں جب حکومت میں انتشار پیدا ہو گیا تب بھی والی تلنگانہ نے خطبات اور سکہ جات میں اپنے آقا محسن محمود شاہ بہمنی ہی کا نام رکھا اور جب ۷ دسمبر ۱۵۱۸ء کو اسکے بادشاہ کا انتقال ہو گیا تو سلطان قلی ہمدانی نے خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس طرح دکن میں پانچ سلطنتیں وجود میں آئیں۔ احمد نگر میں نظام شاہی، برار میں عماد شاہی، بیجاپور میں عادل شاہی، بیدر میں برید شاہی اور تلنگانہ میں قطب شاہی جس کا پایہ تخت گولکنڈہ قلعہ تھا۔

سلطان قلی قطب الملک (۱۵۱۸ء تا ۱۵۴۳ء)

سلطان قلی کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ سلطان قلی قطب الملک بن اویس قلی بن پیر قلی بن مرزا اسکندر بن قرا یوسف بن قرا محمد ترکمان۔ سلطان قلی کا قبیلہ تاریخ میں قرا قونیلو کے نام سے مشہور ہے۔ ترکی زبان میں ''قرا'' سیاہ کو اور ''قونیلو'' مینڈھے کو کہتے ہیں۔ سلطان قطب الملک نے اپنی سلطنت کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی وہ نہایت ہی بہترین تھے۔ اس نے گولکنڈہ کو اپنی حکومت کا مستقر قرار دیا پھر اس کے اطراف کے علاقے فتح کر کے انہیں اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔ سلطان قلی قطب الملک کی زندگی کا زیادہ تر حصہ جنگ و جدال میں گذرا۔ اس کی سلطنت کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۷۰ قلعے اس کی علمبرداری میں شامل تھے جنہیں اس نے فتح کئے تھے۔ سلطان قلی قطب الملک ایک عظیم بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باتدبیر سپہ سالار اور بہترین سپاہی بھی تھا۔ اس کو فن تعمیر سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس نے محمد نگر شہر کی بنیاد ڈالی جس سے آنے والی دنیا میں اسکے آثار نمایاں تھے۔ سلطان قطب الملک نے غیر معمولی طویل عمر پائی۔ چنانچہ اس کے شہزادوں میں بھی بڑھاپے کے آثار رونما ہونے لگے تو جمشید قلی نے جوان دنوں قلعہ میں تھا، قلعدار میر محمد ہمدانی کے توسط سے ایک سازش رچی اور اپنے باپ سلطان قلی قطب الملک کو ۱۵۴۳ء میں جامع مسجد گولکنڈہ میں بحالت سجدہ قتل کرا دیا۔ اس وقت سلطان کی عمر ۹۹ برس سے زائد ہو چکی تھی۔ اس نے ۲۵ سال تک آزاد بادشاہ کی طرح دکن پر بڑے آب و تاب کے ساتھ حکمرانی کی۔ ان کی مزار پر اس طرح فارسی میں کتبہ کندہ ہے جس پر تین حصوں میں عبارت لکھی ہوئی

ہے، جو بہترین خطِ نسخ اور خطِ توقیع کا نمونہ ہے۔ اس میں پہلے پنجتن پاک، بارہ امام اور آیۃ الکرسی کندہ ہے۔ اس کی تاریخ وفات تعمیر 950 ہجری ہے۔

"مجاهد فی سبیل الله و الملک السلطان قلی المخاطب به قطب الملک المشهور به بر ملک انار الله برهانه الی جبال رحمة الله فی یوم الاثنین جمادی الثانی 950 هجری

ان کی تاریخ وفات (فیض ہند 950 ہجری) سے نکالی جاتی ہے۔

جمشید قلی قطب شاہ (۱۵۴۳ء تا ۱۵۵۰ء)

جمشید قلی قطب شاہ نے اپنے والد کے قتل کے بعد فوری اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنے بھائی ابراہیم قلی کو جسے سلطان قلی قطب الملک نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا، دکن کی سلطنت سے بے دخل کر دیا۔ پھر بھی اس کی حکومت کی مدت ۷ برس ہی رہی۔ اگر چہ جمشید نے تخت نشین ہونے کے بعد رعایا کو خوش کرنے کی کئی کوششیں کیں اور انہیں انعام واکرام سے سرفراز کیا، کئی ایک معاملات مین انہیں خود مختار بھی بنا دیا لیکن حاکم اور محکوم میں خوشگوار تعلقات پیدا نہ ہو سکے۔ اس کی طبیعت کی ترشی وتند مزاجی نے اس کے بہتیرے مخالف پیدا کر دیئے تھے۔ ۱۵۵۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ جمشید کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ میدان جنگ میں ایک ادنی سپاہی کی طرح لڑتا اور جب تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوتا تو ایک عادل حکمران کی طرح۔ اس نے بعض اوقات اپنے دشمنوں کو بھی مصیبت میں دیکھ کر ان کی مدد سے گریز نہیں کیا چنانچہ امیر برید اور ولی بیدر جو متواتر اس سے جنگ کرتے رہتے تھے، جب عادل شاہوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو عاجزی کے ساتھ انھوں نے جمشید سے معافی طلب کی اور جمشید نے اپنے فراخدلانہ رویہ کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں معافی کے ساتھ قید سے رہا کرا دیا۔ اس کی اچھی فوجی تدبیریں اور دلیری وشجاعت ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کے سات سالہ دور اقتدار میں کسی بھی جنگی معرکہ میں قطب شاہی فوجوں کو شکست نہیں ہوئی اور دیگر سلاطین اس کے اس ہمدردانہ رویہ پر ہمیشہ اس کی امداد کے طالب رہتے تھے۔ جمشید قلی، ایک عظیم بادشاہ ہونے کے ساتھ باکمال ادب پرور، علم نواز اور فصیح وبلیغ شاعر بھی تھا۔

سبحان قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ء تا ۱۵۵۰ء)

سبحان قلی قطب شاہ کی عمر اس کی تخت نشینی کے وقت صرف سات سال تھی۔ اس کے والد جمشید قلی قطب شاہ کے مخالفین اور ابراہیم قلی قطب شاہ کے ہمدردوں کی تعداد دربار میں زیادہ تھی۔ اس لئے نوعمر بادشاہ کو اپنے والد کے انتقال کے بعد صرف ۳ ماہ اور چند دن ہی حکومت کرنے کا موقع ملا۔ ابراہیم قلی نے چند امراء کی مدد سے پہلے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور نوعمر بادشاہ کو برطرف کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جب سبحان قلی تخت نشین ہوا تو اس کے ایک زبردست حریف دولت قلی نے بھونگیر قلعہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ ابراہیم قلی نے قلعہ بھونگیر میں دولت قلی کا قتل کروا کر یہ قلعہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور گولکنڈہ قلعہ میں سبحان قلی کو قتل کر کے جملہ قطب شاہی مملکت اپنے اقتدار میں لے لی۔

ابراھیم قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء)

جب ابراہیم قلی قطب شاہ تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے اپنے جانثار مصطفیٰ خان کو اس کی بے شمار ہمدردی اور تعاون کی بناء پر اپنا وزیراعظم مقرر کیا۔ فوجی اسلحہ کو مضبوط کیا۔ ۱۵۶۲ء میں راجمندری میں دریائے کرشنا کے کنارے جو دکن کی پانچوں سلطنت کے بیچ معرکہ ہوا اس میں قطب شاہی سلطنت غالب ہوئی اور راجمندری پر بھی قطب شاہی جھنڈا لہرا دیا گیا۔ ابراہیم قطب شاہ کا دور جنگی معرکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک فتنہ فرو ہوتا کہ دوسرا سر اٹھانے لگتا، مگر ابراہیم قلی کی شاہی اقبال یاوری نے ہر جگہ اس کو فتح دلائی۔ اس کے دور حکومت میں قلعہ گولکنڈہ کی فصیلیں اور بلند و بالا دروازے تعمیر کئے گئے۔ قلعہ گولکنڈہ کے اندر بالا حصار میں کئی ایک محلات و بلند و بالا و خوبصورت مساجد تعمیر ہوئیں۔ ان تمام کارہائے نمایاں اور تیس سالہ دور اقتدار کے بعد ۱۵۸۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ان کی مزار پر بھی کتبہ کندہ اس طرح ہے:۔

قدان تقل ---------------- ربیع الثانی سنه ثمان و ثمانین و تسعمایة من الهجرة النبویة۔

اس کتبہ پر قرآن مجید کی آیات اور نادِ علی درج ہے۔ اس مقبرہ کے اطراف میں کل سولہ مزارات ہیں۔ کسی شاعر نے ان کی تاریخ وفات اپنے اشعار میں اس طرح نکالی ہے:۔

چون زدنیا سوی عقبیٰ رخت بست　　شاہ ابراہیم شاہ اہل جاہ
سال وصال روست ''فیاض زمان''　　نیز زیباتاج ابراہیم شاہ

۹۸۸ھ

محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۲ء)

محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم قلی قطب شاہ کا فرزند ثانی تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں قطب شاہی سلطنت کو ہر لحاظ سے عروج حاصل ہوا۔ دکن میں تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہو گیا۔ اس کے ہمسر شمال میں مغلیہ حکومت تھی اور تخت پر اکبراعظم جلوہ افروز تھا۔ قطب شاہی دور کی علم نوازی ادب پروری اور تمدن کا چرچا اکبر کے دربار تک پہنچ گیا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کسی قوم و ملک کا تمام سرمایہ اقتدار صرف جنگ و جدال ہی نہیں ہے بلکہ تعمیری اور تمدنی تہذیب کی آبیاری بھی قوم کے عروج کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے۔ قلی قطب شاہ نے جنگ و جدال سے ہٹ کر ان اہم ستونوں کی تعمیر کی۔ اس نے تلنگانہ کو اپنا گھر اور تلنگی رعایا کو اپنی رعایا سمجھا۔ محمد قلی وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے اپنی مادری زبان سے ہٹ کر اپنی ملکی اکثریت کی زبان تلگو میں شعر و شاعری ہی نہیں کی بلکہ درباری زبان کے طور پر بھی اسی زبان کو رائج کیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے شہر حیدرآباد کی تعمیرات پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ اس کے دور میں تعمیر کردہ عمارات جو لاثانی فن تعمیر کا نمونہ ہیں اور جن کا شہرہ ساری دنیا میں ہے ان میں چار مینار، چارکمان، جامع مسجد، دارالشفاء، الٰہی محل اور باغ محمدی آج بھی اس کی طبیعت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ

نبات محل، گھاٹ محل، کوہ طور، ندی محل، حنا محل، داد محل، خداداد محل اور خاص کر اس نے جگہ جگہ لنگر خانے تعمیر کرائے جن میں مسافرین کے طعام ورہن سہن کا انتظام سرکاری خزانہ سے کیا جاتا تھا۔ بادشاہ کا عاشور خانہ جو ساری دنیا میں اپنے فن تعمیر اور فن خطاطی کے لئے جانا جاتا ہے، محمد قلی ہی کا تعمیر کردہ ہے۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں اس وقت ۷۰ لاکھ ہن کا صرفہ ہوا۔ محمد قلی کو عربی فارسی، دکنی اور اردو کا ایک بلند پایہ شاعر بھی مانا جاتا ہے۔ اس کا دیوان جس میں اردو و فارسی کلام درج ہے، آج بھی اس کی ذہانت کی داد لیتا ہے۔ شاعری کے علاوہ اس کو خوشخطی کا بھی شوق تھا۔ نستعلیق اور نسخ خوب لکھتا تھا۔ اس کے دور میں ایران وعراق کے علماء، قطب شاہی سلطنت میں آ کر جمع ہوئے اور گولکنڈہ میں علم وادب کا خوب بول بالا رہا۔ ۳۱ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۶۱۲ء میں اسکا انتقال ہوا۔ اس کی مزار پر اس طرح کتبہ کندہ ہے جس پر آیات قرآنی کیسا ساتھ ساتھ شیعہ درود اور نادعلی درج ہے۔ کتبہ اس طرح ہے:۔

اعلیٰ حضرت جنت مکانی عرش آشیانی محمد قلی قطب شاہ بن ابراہیم قطب شاہ انار اللہ برہانہ ۔ بتاریخ روز دوشنبہ ہفدہم ماہ ذی الحرام 1020 ہ برحمت حق واصل شد سن شریفش چہل ونہ سال و مدت سلطنتش سی ویك سال ۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ ، رحمت کامل عطا۔

اس کی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکالی گئی ہے:۔

محمد ت چون از دار فانی — مثال آن شه دین سال فیاض
زقطب فضل و فضل عام جستم — دگر بازی زعالی جاه فیاض (۱۰۲۰ھ)

محمد قطب شاہ (۱۶۱۲ء تا ۱۶۲۶ء)

محمد قلی قطب شاہ نے اپنے انتقال سے قبل وصیت کر دی تھی کہ اس کے انتقال کے بعد اس کے بھتیجے فرزند سلطان محمد امین جو محمد قلی قطب شاہ کا داماد بھی تھا، تخت نشین کیا جائے۔ اس لئے سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی۔ اس وقت اس کی عمر ۲۱ سال تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغل اپنا تسلط دکن پر بڑھا رہے تھے اور محمد قطب شاہ نے مصلحت کے تحت مغلوں سے صلح کر لی۔ شہزادہ خرم (شاہجہاں) فاتح شہزادہ کی حیثیت سے دکن میں داخل ہوا۔ سلطان محمد قطب شاہ نے مغل شہزادہ کی بڑی مہمانداری کی جس سے قطب شاہوں اور مغلوں کے تعلقات مستحکم ہو گئے۔ محمد قطب شاہ بے حد مہمان نواز اور فراخدل بادشاہ تھا۔ اس لئے اس کے دربار میں دور دور سے سفیر حاضر رہتے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے۔ محمد قطب شاہ صوم صلوٰۃ کا سخت پابند تھا۔ اس کے عادات واطوار نہایت ہی سادہ اور زبان زد خاص وعام تھے۔ حیدرآباد میں مکہ مسجد کی بنیاد اسی کے عہد میں عمل میں آئی لیکن اس کی تکمیل ہونے سے قبل ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ محمد قطب شاہ نے اپنے آخری زمانہ میں حیات نگر کی شاہراہ پر سلطان نگر کے نام سے ایک اور شہر کی بنیاد ڈالی۔ بیرونی حصار، خندق اور مکانات بھی تیار ہو گئے تھے مگر اسی اثنا میں بادشاہ کے انتقال سے یہ کام ادھورا رہ گیا۔ اس کو شعر وشاعری کا بھی شوق تھا اور جملہ اشعار حضرت محمد ﷺ کی شان مبارک اور رب کریم کی حمد وثنا کے مضمون میں ہیں۔ ۱۴ سال حکومت کرنے کے بعد اس پروانۂ محمدیؐ کا ۱۶۲۶ء انتقال میں

ہوا۔ اوراس کی مزار پراس طرح کتبہ کندہ ہے جس پر آیۃ الکرسی، درود شریف اور قرآنی آیات کے بعد فارسی میں اس طرح عبارت درج ہے:۔

وفات اعلیٰ حضرت جنت مکانی سلطان محمد قطب شاہ ابن مرزا محمد امین ابن ابراہیم قطب شاہ، تعمیر یوم الاربع سیزدہم جمادی الاول 1035ھ ، ولادت باسعادتش درماہ رجب 1001ھ ، جلوس ہمایونش۔

سلطان عبد اللہ قطب شاہ (۱۶۲۶ء تا ۱۶۷۲ء)

اپنے والد کے انتقال کے بعد جب عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی تو تخت کے اطراف امراء کا جمگھٹ لگا رہتا تھا لیکن رفتہ رفتہ نوخیز بادشاہ نے خود اعتمادی سے صورتحال کو پرسکون بنا دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اپنے آپ میں ایک مکمل حکمران بن گیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے مغلیہ دربار سے بھی دوستانہ تعلقات قائم کئے۔ اس کے دور میں جہانگیر مغل دربار میں تخت نشین تھا۔ اس نے جہانگیر کو کئی تحائف بھیجے۔ بادشاہ کی حکومت کا ایک بڑا حصہ عیش وعشرت میں گذرا۔ اس وقت امراء نے بھی اپنی طاقت بڑھانی شروع کر دی تھی۔ شمال میں شاہجہاں، سلطنت مغلیہ کا بادشاہ قرار پا گیا۔ جب دکن پر شاہجہاں کی فوج کشی کی خبریں عام ہوئیں تو اس نے بھی اپنی فوجوں کو وسعت دی۔ اس نے شاہجہاں کو بے شمار تحائف بھی بھیجے جس سے خوش ہوکر اس نے اس کی مملکت کے فتح شدہ علاقے اسے واپس کر دیئے۔ اب عبداللہ قطب شاہ کو اپنی حکومت مضبوط کرنے کا وقت مل گیا اور اس نے محمد سعید میر جملہ کو ایک بڑا لشکر دے کر کرناٹک کی طرف روانہ کیا۔ میر جملہ، کئی ایک چھوٹے بڑے علاقوں کو فتح کرتے ہوئے دریائے گوداوری کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ ان فتوحات نے میر جملہ کو مغرور کر دیا۔ اب وہ کئی کاموں میں بادشاہ کی ناراضگی کا سبب بھی بنا۔ میر جملہ، عبداللہ قطب شاہ کے عتاب سے ڈر کر شاہزادہ اورنگ زیب کا جوان دنوں اورنگ آباد میں مقیم تھے، دامن تھام لیا۔ پہلے اورنگ زیب نے اپنے فرزند سلطان محمد کی سرگردگی میں لشکر جرار دیکر روانہ کیا۔ کافی عرصہ تک لشکر کو کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ آخر کار خود اورنگ زیب بنفس نفیس دکن کو آ پہنچے۔ اس وقت عبداللہ قطب شاہ کی والدہ حیات بخشی بیگم کے توسط سے مغل شاہزادہ عالمگیر اور عبداللہ قطب شاہ میں صلح ہوئی تب کہیں جا کر عبداللہ قطب شاہ کو اطمینان حاصل ہوا۔ عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں بیشمار نامور شعراء جمع تھے۔ وہ خود تو شاعر نہ تھا مگر شعراء، ادباء اور علماء کی سرپرستی دل کھول کر کرتا تھا۔ آخر کار یہ بادشاہ ۴۷ سال کی عمر میں ۱۶۷۲ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

سلطان ابوالحسن تاناشاہ (۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۷ء)

عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد گولکنڈہ کے امراء میں رسہ کشی چلنے لگی کیونکہ عبداللہ قطب شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس کے دامادوں میں سب سے زیادہ طاقتور سلطان ابوالحسن تھا۔ لہٰذا وہ تخت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ سید مظفر از رندرانی کو وزارت عظمیٰ دی مگر کچھ عرصہ بعد اسے معزول کر کے مدنی کو وزیر مقرر کیا اور اتنی کو پیشکار سلطنت بنایا۔ بس انہی وجوہات کی بناء پر وہ اورنگ زیب

کے عتاب کا شکار رہوا۔ بیشتر سلاطین کی طرح تانا شاہ نے بھی تعمیرات کیں۔۱۶۸۲ء میں بصرفہ ۸ لاکھ ہن موسیٰ ندی کے کنارے چار محل تعمیر کیا۔ اس عظیم الشان عمارت کی تعمیر کے سو سال بعد اس کے بارود خانہ میں آگ لگ جانے سے یہ عمارت تباہ ہوگئی۔تانا شاہ نے ایک محلّہ بھی اسی نام سے آباد کیا تھا جو ۱۹۰۸ء کی موسیٰ ندی کی طغیانی میں مکمل طور پر برباد ہوگیا۔مکہ مسجد کی تعمیر اسی کے دور میں مکمل ہوئی۔حوض گوشہ محل کی عمارات جو اپنی وسعت، بلندی و بےنظیری میں مثال نہیں رکھتیں، ابوالحسن تانا شاہ کی ہی تعمیر کردہ ہیں۔آج بھی باقی ہیں۔

اگر چہ عبداللہ قطب شاہ اور تانا شاہ کا عہد سیاسی اعتبار سے بہت ہمت شکن تھا، اس کے باوجود گذشتہ روایات کو انہوں نے برقرار رکھا۔ تمدنی کام برابر ہوتے رہے۔اسی افراتفری کے زمانہ میں جب کہ مغل شہنشاہ عالمگیر کی فوجوں نے ۱۶۸۷ء میں قلعہ کا محاصرہ کرلیا، گولکنڈہ نے اپنی روایتی خودداری اور اولوالعزمی اپنے ہاتھوں سے جانے نہیں دی۔مغل افواج کے مقابلہ میں اہل قلعہ نے اس قدر دل کھول کر مدافعت کی کہ عالمگیر کو اپنی بے پناہ طاقت کے باوجود گولکنڈہ قلعہ کی تسخیر میں ۸مہینوں سے زیادہ کا وقت لگ گیا۔لیکن پھر بھی قلعہ کے فتح ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔اسی اثناء میں چند بے وفاؤں نے قلعہ کا دروازہ مغل افواج کے لئے کھول دیا لیکن اس حوصلہ شکن ماحول میں بھی گولکنڈہ میں اکثر افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی روایتی وفاداری کے لئے اپنی جانیں، جان عزیز کے حوالے کردیں۔گولکنڈہ کی جنگ میں بہادری کی مثال عبدالرزاق لاری کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جس نے وفاداری اور بادشاہ کے لئے قربانی ونمک حلالی کا جو ثبوت دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ کے لئے یادگار رہے۔ابوالحسن تانا شاہ کی نزاکت، عیش پرستی اور سادہ لوحی کے قصے مشہور ہیں۔وہ مستقل مزاج، مدبر اور متوکل بادشاہ تھا۔گرفتاری کے وقت بھی اس کی پیشانی پر کوئی شکن موجود نہ تھی۔اولوالعزم اور صوفیانہ مزاج بادشاہ قلعہ دولت آباد میں ۱۴سال قید رہنے کے بعد ۱۷۰۱ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور دولت آباد میں ہی دفن ہوا۔ تانا شاہ کی عمر کے ۱۴سال عہد طفلی میں ۱۴سال تحصیل علوم میں، ۱۴سال اپنے پیر مرشد سید شاہ حسینی راجو قتالؒ کی خدمت میں اور ۱۴ سال کا دور حکمرانی اور ۱۴سال قید میں گذرا۔یہ ایک تعجب خیز بات تھی۔یہ شاعر بھی تھا اور اس کے دربار سے شاعر بھی وابستہ تھے۔

☆☆☆

آئینۂ تحقیق

اس کالم کے تحت ہندوستان کی مختلف دانشگاہوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچنے والے شعبۂ فارسی کے تحقیقی مقالات کی فہرست پیش کی جائے گی۔ جریدہ کے اس شمارے میں شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جمع ہونے والے تحقیقی مقالات کی فہرست پیش کی جا رہی ہے جسے یونیورسٹی کے تھیسس سیکشن کے کیٹلاگ کے مطابق ہو بہو یونیورسٹی کے نمبر شمار کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ (مدیر)

پایان نامهائے شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

محمد ضیاء الحق، ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نمبر شمار	کیٹلاگ نمبر	عنوان مقالہ	مقالہ نگار	نگراں	سن
۱	T- 681	دیوان مظہر۔ترتیب وتصحیح	عبدالرزاق		۱۹۶۷ء
۲	T-682	A Critical study of persian literature during Khalji Period 1290-1320.	Mohammad Motasim Abbasi	Prof. Nazir Ahmad	1967
۳	T- 2876	مطالعہ تنقیدی فوائد الفواد (شعبان ۷۰۷ھ تا شعبان ۷۲۲ھ)	افشاں آفتاب	دکتر ام ہانی فخر الزماں	۱۹۸۲ء
۴	DS- 2450	عہد جہانگیر میں تصنیف شدہ تین اہم تذکروں میخانہ عبدالنبی فخر الزماں، مجمع الشعرای جہانگیری تالیف ملا قاطعی ہروی اور عرفات العاشقین اوحدی کا تنقیدی مطالعہ۔	افضال احمد	پروفسور سمیع الدین احمد	۱۹۹۳م
۵	T- 972	مجموعہ قصائد و مراثی و ترجیحات وقطعات و رباعیات۔ جمالی دہلوی (شاعر دورۂ اواخر قرن نہم واوائل قرن دہم ہجری)۔	اختر بانو	دکتر ام ہانی فخر الزماں	۱۹۷۰ء
۶	DS- 2650	عہد خلجی وعہد تغلق کی فارسی لغات	فرح مشیر	پروفیسر ماریہ بلقیس	۱۹۹۴ء

۷	DS-861	سہم بھوپال در تذکرہ نویسی شعرای فارسی (در قرن نوزدہم میلادی)	خانم رقیہ فاروقی	دکتور محمد طارق	۱۹۸۴ء
۸	DS- 2957	سترہویں صدی کے دوران ہندوستان میں صوفی رجحانات کا تنقیدی مطالعہ	عصمت بانو	ڈاکٹر نصیر احمد صدیقی	۱۹۹۶ء
۹	T-144	Imadi: His life, time and works.	Muhammad Shamoon Israeli		1958
۱۰	T-1543	دیوان مجیر بیلقانی، تصحیح وتحشیہ	کبیر احمد جائسی	دکتر نذیر احمد	۱۹۷۳ء
۱۱	DS-1005	تاج المآثر کے معاصر ادب کا مطالعہ	جمیل احمد	ڈاکٹر محمد خالد صدیقی	۱۹۸۶ء
۱۲	DS-2645	اخبار الاخیار کا تنقیدی جائزہ	اصباح خان	ڈاکٹر سید راشد حسین	۱۹۹۴ء
۱۳	T- 3254	خزانۂ عامرہ کا تنقیدی مطالعہ مع مقدمہ وحوا	سعیدہ خانم	پروفیسر وارث کرمانی	۱۹۸۵ء
۱۴	T-75	A survay of Persian Literature in Afghanistan 1747-1935.	Khan Saeed Hamid		1967
۱۵	T-4746	Ali Hazin: A Critical evaluation of poetic writings.	Mrs. Noor Afshan Kirmani	M. Khalid Siddiqi	1986
۱۶	T- 526	Evaluation of Ghalib persian poetry.	Waris Kirmani	Dr. Md. Shamoon Israili	March 1965
۱۷	T-1805	A critical study of Chandra Bhan Barhaman and his works.	Jagdish Narain Kulshreshtha	Dr. Muhammad SHamoon Israeli	1976
۱۸	DS-750	پیشرفت عقیدۂ تصوف در اوائل عہد اسلامی	افتخار النبی احمد مدنی	دکتر سید نبی ہادی	۱۹۸۴ء
۱۹	T- 3586	ہندوستان میں تیرہویں صدی عیسوی کا عرفانی ادب	افتخار النبی مدنی	پروفیسر سید نبی ہادی	۱۹۸۷ء
۲۰	T- 971	جمع آوری و تصحیح و ترتیب اشعار پراگندہ فارسی در ہندوستان	ماریہ بلقیس	دکتر محمد شمعون اسرائلی	۱۲۹۰م
۲۱	T-5606	سہم شاپور در شعر فارسی	محمد عثمان غنی	پروفسور آزرمیدخت صفوی	۲۰۰۱ء

۲۲	DS-1998	عہد سلطنت کے اولین شاعر سراجی خراسانی کے معاصر شعراء شہاب مہمرہ، تاج الدین ریزہ اور جمال الدین ہانسوی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	رضیۃ الزہرا	پروفیسر سمیع الدین احمد	۱۹۹۰ء
۲۳	DS-997	A Critical evaluation of Masud's Poetry	Mohammad Abdul Rahman	Dr. Samiuddin Ahmad	Feb.1987
۲۴	DS-1668	A survey of Persian Prose Literature from Babur (A.D.1526) to Akbar (A.D.1605)	Mohd. Hachim Ali	Mrs. Anwar Rizvi	1989
۲۵	DS-2648	تعارف تذکرہ ہای شعرای فارسی نوشتہ در ہند از آغاز تا دور محمد شاہ بادشاہ دہلی	محمد ابصار احمد	دکتور نصیر احمد صدیقی	۱۹۹۴ء
۲۶	DS- 1004	سراج الدین علی خان آرزو۔ بحیثیت تنقید نگاری	سید محمد اصغر	پروفیسر وارث کرمانی	1987
۲۷	DS-2894	انشای ماہرو کا تنقیدی مطالعہ	سید محمد اسد علی خورشید	پروفسور آزرمیدخت صفوی	۱۹۹۵ء
۲۸	T-4147	تنقید و تدوین دیوان آرزو۔ با مقدمہ و حواشی	سید محمد اصغر	پروفیسر وارث کرمانی	۱۹۸۹ء
۲۹	T-898	A critical evaluation of the works of Yusuf bin Mohammad Yusufi- A famous Physician, poet and Munshi of Babar & Humayun.	Muhammad Tayyab	Prof. Nazir Ahmad	1970
۳۰	DS-3062	سہ سخنسرایان از خانوادۂ نور جہان بیگم	محمد عثمان غنی	پروفیسر آزرمی دخت صفوی	۱۹۹۷ء
۳۱	T-3368	لطایف اشرفی کا تنقیدی جائزہ	محی الدین اظہر	ڈاکٹر سمیع الدین احمد	۱۹۸۲ء
۳۲	T-5805	بررسی انتقادی فروغ فرخزاد، بعنوان شاعرہ	حافظ محمد مختار عالم	دکتر محمد آصف نعیم صدیقی	۲۰۰۲ء
۳۳	T-149	Talib-i-Amli:- The poet laureat of Jahangir, His life, time and works.	سید نبی ہادی		۱۹۶۴ء
۳۴	T-4146	صہبائی کی فارسی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ	خانم زاہدہ پٹھان	دکتور نصیر احمد صدیقی	۱۹۸۸ء
۳۵	DS-863	صہبائی کی نثری تصانیف پر ظہوری اور بیدل کے اثرات	خانم زاہدہ پٹھان	دکتور سمیع الدین احمد	۱۹۸۶ء
۳۶	DS-2956	مطالعہ انتقادی سیر الاولیاء و نفائس المآثر	غلام اشرف قادری	استاد سید محمد طارق حسن	۱۹۹۶ء

۳۷	T-5228	تدوین وتحاشی انتقادی بر طبقات شاہجہانی واحوال و آثار مصنف	غلام اشرف قادری	سید محمد طارق حسن	۱۹۹۸ء
۳۸	T-2424	تدوین و ترتیب کتاب ترجمہ مسالک و الممالک تالیف۔ شیخ ابواسحاق اصطخری	قمر غفار	نبی ہادی صاحب	۱۹۸۱ء
۳۹	T-1806	A critical evaluation of persian prose of the 16th century in India.	Syed Rashid Hussain	Dr. Samiuddin Ahmad	
۴۰	T-474	A critical study of the Tazkira of Persian Poets Compiled in India From the middle of the 16th to the middle of the 17th century A.D.	Saiyid Muhammad Fida Abbas Rizvi	Prof. Nazir Ahmad	1961
۴۱	T-4985	سہم بابر و ہمایون در ادبیات فارسی	رعنا خورشید	پروفیسر آزرمی دخت	۱۹۹۶ء
۴۲	DS-2649	عہد شیر شاہ واسلام کے ادباء اور علماء	رعنا خورشید	پروفیسر آزرمی دخت	۱۹۹۴ء
۴۳	DS- 2647	مقایسۂ انتقادی تراجم احوال شعرای زیر کہ در خزانہ عامرہ ومردم دیدہ یافتہ می شود (آفرین لاہوری، آرزو اکبر آبادی، فقیر دہلوی، حزین لاہیجی، والہ داغستانی، وقف بٹالوی، وجدان سرندی)	سید مظاہر علی رضوی	پروفیسر سید محمد طارق حسن	۱۹۹۴ء
۴۴	T-2877	سولہویں اور سترہویں صدی کی فارسی شاعری میں ہندوستانی عناصر	روشن آرہ	پروفیسر نذیر احمد	۱۹۸۲ء
۴۵	T-1950	Saadi: As a Humanist and Lyricist	Azarmi Dukht	Prof. Nazir Ahmad	1978
۴۶	T-193	Haji Mohammad Jan Qudsi of Mashhad:- His life, Times and works.	Samiuddin Ahmad	Prof. Zia-i-Ahmad	1962
۴۷	DS-2646	سہروردی سلسلہ درویش جمالی کے عہد	شبیہ فاطمہ	ڈاکٹر زہرہ عرشی	
۴۸	DS-1914	فارسی ادبیات وعلوم کی ترویج میں ہمایوں کا حصہ۔ ایک مختصر جائزہ	ساجدہ شروانی	ڈاکٹر سید محمد طارق	۱۹۹۰ء

۱۹۸۹ء	ڈاکٹر نصیر احمد صدیقی	شاہ وصی اللہ	ابتدائی عہد غزنوی کے ادبی و ثقافتی حالات کا ایک مختصر جائزہ۔	DS-1915	۴۹
۱۹۶۷ء		محمد خالد صدیقی	دیوان نجیب الدین جرباذقانی۔ شامل قصائد و مقطعات و غزلیات و ترجیعات و رباعیات ۔تصحیح و ترتیب وتحشیہ وتعلیق	T-748	۵۰
1965	Dr. Nazir Ahmad	Naseer Ahmad Siddiqui	A critical edition of Sanai Mashhadi"s Diwan with introduction and notes	T-528	۵۱
1966	Professor Nazir Ahmad	Muhammad Amiruddin Siddiqui	The Life and Poetry of Muhammad Rida Nau'i Khabooshani with A critical edition of his odes	T-598	۵۲
1965		Mrs. Umm-i-Hani Fakhruz Zaman	An account of Persian poets connected with India As contained in the Nafaisul Maathir.	T-461	۵۳
1974	Dr. Mrs. U.F. Zaman	Mrs. Safia Jaria	The story of Yusuf and Zulaikha in persian Verse.	T-1438	۵۴
1988		خانم زرینہ خان	عہد اورنگ زیب کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ تا عہد بیدلؔ	DS- 1999	۵۵
1977	Dr. Waris Kirmani	Syed Zia ullah	The political and Social themes in modern persian fiction	T-1945	۵۶
1957		Zohra Iqbal	Ghazali: His life and works	T-143	۵۷
۲۰۰۱ء	دکتر آزرمیدخت صفوی	سید محمد اسد علی خورشید	منثورات فارسی عہد خلجیہ۔مطالعۂ انتقادی	T-5781	۵۸
1965	Prof. Nazir Ahmad	Nizamuddin	A critical edition of the Lataif-i-Ashrafi Fi Bayan-i-Tawaif-i-Sufi.	T-742	۵۹

٦٠	T-1439	A Critical study of the contemporary of Hafiz: As mentioned in his Diwan.	Gh. Aisha Mufli	Prof. Nazir Ahmad	1974
٦١	T-5968	تصحیح متن انتقادی وتحقیق و بررسی بہ بابہای جواہر العلوم ہمایونی۔از محمد فاضل سمرقندی متعلقہ ادب، تاریخ، اخلاق،آداب مجلس	محمد ساجر	دکتر شوکت نہال انصاری	۲۰۰۲ء
٦٢	T-6428	انعکاس وضعیت اجتماعی در نیمۂ اول قرن بیستم (م) در رمانہای محمد حجازی	احتشام الدین	پروفیسر آزرمیدخت صفوی	۲۰۰۵ء
٦٣	T-7223	A critical edition of Diwan-e-Mirza Kamran(Persian text) with Introduction and Notes	SHabistan Baqa	Prof. Maria Bilquis	2005
٦٤	T-7265	تصحیح نسخۂ خطی تاریخ کشمیر از نارائن کول عاجز	فخر عالم	دکتر آصف نعیم صدیقی	۲۰۰۵ء
٦٥	T-7259	شعر و ادب فارسی در دورۂ خلجیان مالوہ	عبدالسلام جیلانی	پروفیسر سید محمد طارق حسن	۲۰۰۵ء
٦٦	T-7260	کشمیر میں دور شاہجہانی کے اہم فارسی شعراء کی شعری خدمات کا مطالعہ	غلام عباس	ڈاکٹر محمد آصف نعیم صدیقی	۲۰۰۶ء
٦٧	T-7261	ویرایش انتقادی دیوان آزاد بلگرامی۔ ہمراہ مقدمہ و توضیحات	جہانگیر اقبال	دکتر سید محمد اصغر	۲۰۰۶ء
٦٨	T-7452	جوامع الحکایات جلد اول و دوم از قسم سوم ۔تالیف سدید الدین محمد عوفی۔سیاسی وسماجی مطالعہ	کلثیم فاطمہ	ڈاکٹر افشاں آفتاب	۲۰۱۰ء
٦٩	T-7262	تدوین متن انتقادی مثنوی مراۃ المعانی ۔با مقدمہ و حواشی	شگفتہ پروین	پروفیسر ماریہ بلقیس	۲۰۰۸ء
٧٠	T-7263	تصحیح وتدوین دیوان قاسم ارسلان	شگفتہ مشتاق	دکتر سید محمد اسد علی خورشید	۲۰۰۹ء

۷۱	T-7264	Prominent Trends of short story writing in Iran, During the First Half of the 20th century.	Sarfaraz Ahmad Khan	Prof. Azarmi Dukht Safvi	2008
۷۲	T-7456	فارسی زبان وادب میں پروفیسر نذیر احمد کی خدمات	نعیم احمد	ڈاکٹر افشاں آفتاب	۲۰۱۱ء
۷۳	T-7618	مجموعۂ لطائف وسفینۂ ظرائف از سیف جام ہروی کے جلد اول کا تنقیدی مطالعہ	فوزیہ وحید	پروفیسر ماریہ بلقیس	۲۰۱۱ء
۷۴	T-7847	جدید فارسی مذہبی نثر کے پرچمدار استاد مرتضٰی مطہری اور ڈاکٹر علی شریعتی کے آثار واسلوب کا تنقیدی مطالعہ	سید کلب سبطین	پروفیسر آزرمی دخت صفوی	۲۰۱۱ء
۷۵	T- 7865	تغلق عہد کے غیر معروف فارسی شعراء کے کلام کی جمع و تدوین	نصرت انصاری	پروفیسر ماریہ بلقیس	۲۰۰۹ء
۷۶	T-7617	A Critical edition of Zubdat al Tawarikh of Nurul Haque Mashriqui Dehlawi D. 1073 AH. (With Introduction and notes).	Fatima Shareef	Dr. Zohra Arshi	
۷۷	T- 7845	تصحیح وتدوین دیوان مرزا فاخر مکین احوال وآثار او	حنا اسحٰق	دکتر رعنا خورشید	۲۰۱۰ء
۷۸	T-7616	تحقیق وتدوین دیوان مسعود بک مع مقدمہ وحواشی	محمد طارق	ڈاکٹر سید محمد اصغر	۲۰۰۸ء
۷۹	T-7846	سہم شیخ علی حزین در شیوۂ نثر ادبیات ہند ایرانی۔ با توجہ بہ تذکرہ	ابو ایمن محمد رضوان الحق خان	پروفیسر محمد آصف نعیم صدیقی	۲۰۱۱م

☆☆☆

میراث خطی

احمد نوید یاسر ازلان حیدر، ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ارباب علم وفضل اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ فارسی زبان وادب کا بڑا حصہ تمام تر نقصانات کے باوجود ابھی تک مختلف میوزیموں، آرکائیوزوں، لائبریریوں اور ذاتی ذخیروں میں خطی نسخوں کی شکل میں محفوظ ہے۔ جریدہ کی ترجیحات میں یہ مستقل کالم خزینۂ مخطوطات کے عنوان سے شروع کیا جارہا ہے جس میں ایک یا زاید مخطوطات کا تفصیلی تعارف پیش کیا جائیگا۔

نخلستان

Title:- Nakhlistan	Subject:- Adab Nasr	Catalogue no:- 3628
Mss. no:- 324	Acc. no:- 3419	Script:- Nastaliq
Author: Shafiq Aurangabadi		Compiled:- 1218 A.H./ 1803 A.D.
Folios:- 96	Line:- 13	Size:- 12.8x 6.4 cm

Seal:- At last one seal of Shafiq

مذکورہ تصنیف کا مصنف مشہور تذکرہ نگار، معروف مورخ، جادو بیاں نثار، شعلہ انگیز شاعر اور مشرب تصوف کے دلدادہ جناب میر غلام علی آزاد بلگرامی کا علمی، عملی اور معنوی شاگرد رشید لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی ہے۔ فارسی زبان وادب کی ہندوستان میں آمد، نشو ونما کے واقعات کے بجائے اگر اس کے عروج کی طرف نگاہ ڈالی جائے تو ہم یہ دیکھتے ہیں اس زبان وادب کو پروان چڑھانے میں اور تابناک عروج بخشنے کے لئے جتنے گلہائے تابندہ مسلمانوں نے کھلائے ہیں اتنا ہی محنت ومشقت ہندوؤں نے بھی کی ہے۔ انہوں نے اس غیر ملکی زبان کو ہرگز یہ احساس نہ ہونے دیا کہ یہ ان کی زبان نہیں بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ فن انشاء میں سب سے بہترین کارنامے ہندوؤں نے انجام دئے۔ اس کے علاوہ مختلف اصناف ادب میں خواہ وہ تاریخ ہو یا تذکرہ، نظم ہو نثر، لسانیات ہو یا علم الحیوانات، فرہنگ نویسی ہو یا اخلاقی کتب ہمیں ہر میدان میں فارسی زبان وادب کو عروج بخشنے کے لئے ہندو ومسلمان دونوں شانہ بہ شانہ محنت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے آج کے اس دور میں جب فارسی ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک سے بڑھ کر قیمتی سرمائے نظر آتے ہیں خواہ وہ مطبوعہ شکل میں ہوں مخطوطہ کی شکل میں کسی ذاتی یا سرکاری کتب خانے کی زینت ہوں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ فارسی ادب پر اتنا کام ہونے کے باوجود بھی ابھی تک زیادہ تر سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہے۔

شفیق اورنگ آبادی کا نام لچھمی نرائن ماتھر اور تخلص شفیق تھا، ۱۷۴۵ء میں اورنگ آباد کے ایک کھتری کپور خاندان میں اسکی

ولادت ہوئی (۱)، اسکا خاندان علم وفضل کا گہوارہ تھا، اسکے باپ صاحب قلم نثر نگار تھے اور بھائی دل آفریں شاعر جو ذہین تخلص اختیار کرتا تھا، شفیق صمصام الدولہ کے عہد میں منصب اور خطاب ''دولت چند'' سے سرفراز ہوا اسکے بعد وہ نظام علی آصف جاہ ثانی کے دربار سے منسلک ہوا اور انکے بیٹے امیر احمد خان عالی جاہ کے عہد تک شاہی دربار سے منسلک رہا شفیق کے پہلے استاد سید عبدالقادر درسامی تھے، اسکے بعد میر غلام علی آزاد بلگرامی سے تلامذۂ سخن کیا شفیق آزاد بلگرامی سے حد درجہ عقیدت وانسیت رکھتا تھا اسنے کئی مثنویاں میر غلام علی آزاد بلگرامی کی مدح میں کہی ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

لامکاں است مقام آزاد فوق عرش است خرام آزاد
خرمن ہستیٔ اعدا ہنوز فلک پیر بنام آزاد

شفیق اورنگ آبادی بیک وقت مشہور تذکرہ نگار، مورخ، محقق، ونثر ونظم میں یکساں خوبیوں کا حامل منفرد شخصیت تھا اسنے جہاں ایک طرف شاعری میں غزل، منقبت، مثنوی، قصیدہ اور رباعی نیز یہ شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اسکی شاعری مدح ہجو عاشق اور تصوف ہر رنگ سے رنگین نظر آتی ہے اہیں دوسری طرف ادب کی تقریباً ہر صنف میں اپنے آچار چھوڑے ہیں کلام کا نمونہ پیش خدمت ہے:

یاد ایامی کہ عشق نوجوانی داشتم بر سر بازار رسوائی دکانی داشتم
نہ بزم است چو شمع روشن بیاں بزرم است چوں رستم داستاں
بر چوب بست لعلی تو دست نبات را در تیرگی نشاند ز لال حیات را

شفیق اورنگ آبادی کی تصانیف میں چمنستان شعراء، گل رعنا، شام غریباں، تحفۃ الاحباب، تذکرہ گرونانک، تمیق شگرف، حقیقت ہای ہندوستان، مآثر آصفی، بساط الغنائم، حالات حیدرآباد، مآثر حیدری اور وغیرہ بہت معروف ہیں۔ شفیق نے ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں پائی (۲)۔

مذکورہ خطی نسخہ نخلستان بھی شفیق اورنگ آبادی کی ہی تصنیف ہے جس کے بارے میں عام مورخوں اور مذکروں کی رائے یہ ہے کہ اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں (۳)۔ نخلستان اپنے نام، اپنے مضامین اور اپنے موضوع کے اعتبار سے سعدی شیرازی کی معرکۃ الآراء تصنیف گلستان کی تتبع میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے اختتام پر ترقیمہ یا کسی کاتب کا نام نہیں ہے البتہ آخر میں شفیق اورنگ آبادی کی مہر لگی ہوئی ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے اور جیسا کہ اس کی تکمیل پر ''۶ رجب ۱۲۱۹ھ بمجلد رسید'' لکھا ہونے سے یہ گمان اور قوی ہوتا ہے کیونکہ شفیق اورنگ آبادی کی وفات ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء ہے۔ ممکن ہے نسخہ شفیق نے خود اپنے بنفس نفیس لکھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی سے لکھوا کر تصحیح کی ہو اور اپنی مہر بطور سند ثبت کر دی ہو۔ مگر دوسری بات میں مظائقہ یہ ہے کہ پھر کاتب کا نام بھی درج ہونا چاہئے بہرحال واللہ یعلم۔

نسخہ کے دیباچہ میں بسم الله الرحمٰن الرحیم کے بعد درج ہے کہ:

مدحت مر یکتائی را تعالیٰ شانہ که ذاتش مستغنی از صفات است و صفاتش بیحد و لانہایت در ہر صفتی دو تجلی موجود یکی تجلی جمال که ابقا از لوازم اوست و دوم تجلی جلال که افنا ملازم او پس در ہر صفتی وجود و بیداد بہر یك حالت خوف و رجا مہیا:

اول ما در عدم ہم آخر مادر عدم
این وسط موہوم چون طہری که باشد در دو دم(۳)

اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ کی مدح میں کئی اشعار لکھے ہیں اور ان کے بیچ بہترین نثری پیوندکاری بھی کی ہے۔حق تعالیٰ شانہ کی مدحت کے بعد جناب سرورکونین آقائے رحمۃ اللعالمین ﷺ کی شان میں بھی شعری ونثری خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آخرت کی زندگی کے لئے ان کے حضور عاجزانہ دعائیں بھی کی ہیں اور رب العالمین اور رحمۃ اللعالین کے اسماء گرامی بھی نقل کئے ہیں، بعدازیں عرض مدعا کے طور پر نام تصنیف بھی اشعار میں ہی درج ہے:

فیض روح حضرت سعدی اگر کردد مدد
باشد این کشته ہمیشه سبز و مقبول انام
چونکه نخلستان ز نقلستان قریب المخرج است
میتوان این نقل ہا را خواندن از ہر دو نام(۴)

مندرجہ بالا اشعار میں تصنیف کا نام، اس کے تکمیل سال اور مصنف کا نام بھی موجود ہے، مصنف چونکہ خود ایک بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ گوئی میں کمال رکھتا تھا لہٰذا اس نے اپنی اس تصنیف کی بھی تاریخ نکالی ہے:

یکہزار و دو صد و ہیجده ز ہجرت سال بود
گشت نخلستان بفضل حق تعالیٰ انصرام
گر کنی پیوند طوبی را ز نخلستان شفیقؔ
بر دہد تاریخ تحریرش برای خاص و عام(۵)

مندرجہ بالا آخری شعر کے پہلے مصرعے میں طوبیٰ اور نخلستان کے عدد جوڑنے سے تاریخ تصنیف ۱۲۰۸ھ برآمد ہوتا ہے۔اسکے علاوہ مصنف نے اپنے دیباچہ میں یہ واضح کر دیا ہے کہ گلستان سعدی کی طرح نخلستان ابواب پر مشتمل نہیں ہے۔تمام تصنیف اخلاقی پند و نصائح پر محیط ہے اوران باتوں کو سمجھانے کے لئے حکایات درج کی ہیں، گلستان کی طرح اس میں بھی نثر کے ساتھ ساتھ اشعار کی بہترین

پیوندکاری کی گئی ہے۔مقدمہ میں جہاں بہترین انشاء پردازی کا ثبوت دیا گیا ہیو ہیں آگے حکایات کی نثر سادہ اور عام فہم ہے۔تصنیف کا آغاز حکایات سے ہوتا ہے:

آغاز تصنیف:

حکایت:۔ آوردہ اند روزی فیما بین امامین معصومین صلوات علیہما (شکر آبی رو داد)(۲) چون پاسی ازین معاملہ در گذشت و از جانب سید الشہداء امام الدین والدنیا حضرت حسین شہید دشت کربلا نسبت برادر بزرگ عذر خواہی یا تصفیہ بعمل نیامد:

خود کان را عذر بہ محمود باشد با کرام
جام را پا بوسی (......۷) بود لازم مدام(۸)

تصنیف کا اختتام مندرجہ ذیل اشعار پر ہوتا ہے،اوراس کے نیچے شفیق کی مہر لگی ہوئی ہے:

اختتام تصنیف:

ہر کہ در پوستن شعر فتد
زانکہ لباس صاحب سخن است
ای شفیق از چہ عاصیل لیکن
خالق من غفور ذو المنن است(۹)

حواشی:

(۱) لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے،سید محمد رضا ساجد رضوی،۱۹۸۵ء،نامی پریس لکھنؤ،ص۸۱
(۲) ایضاً۔ص۱۰۵
(۳) نسخہ سالار جنگ،ص۱۱الف
(۴،۵) ایضاً۔ص۶الف
(۶) ایضاً۔ص۱۱۱الف۔کرم خوردہ (لشکر آبی روداو)
(۷) ایضاً ص۱۱۱الف کرم خوردہ
(۸) ایضاً۔ص۱۱۱الف
(۹) ایضاً۔ص آخر

☆☆☆

چشم بینش

تصنیف: **چندر بھان برہمن کی فارسی شاعری** مصنف: **ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی**

صفحات: ۲۱۶ قیمت: ۲۲۰ روپے

ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، اور شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد مبصر: **مناظر حق بدایونی**

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے شعبۂ فارسی میں ایسوسیٹ پروفیسر کے عہدے پر اپنی علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ اعظم گڑھ کے معزز علمی وادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، کثیر التصانیف مصنف ہیں، ان کے مضامین اکثر و بیشتر ملک و بیرون کے ادبی جریدوں اور مجلوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں ان کی انہی ادبی سرگرمیوں کے عوض انہیں حال ہی میں پریسیڈینٹ اوارڈ (برائے نوجوان اساتذۂ فارسی) سے بھی نوازہ گیا ہے۔ چندر بھان برہمن فارسی زبان کا پہلا ہندو صاحب دیوان شاعر تھا۔ وہ تصوف میں خاص دلچسپی رکھتا تھا جسکی وجہ سے تذکرہ نویس اسکو ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ مغل بادشاہ شاہجہاں کے دربار میں منشی بھی تھا اور داراشکوہ کے دربار سے منسلک تھے۔

'چندر بھان برہمن کی فارسی شاعری' برہمن کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے جو جون ۲۰۱۱ء میں شایع ہوکر منظر عام پر آئی۔ نومبر ۲۰۱۴ء میں ریسرچ کے سلسلہ میں حیدرآباد جانے کا موقع ملا تو ڈاکٹر صاحب موصوف سے ملنے کی تمنا دل میں ہوئی اور ملاقات کی غرض سے انکے شعبہ میں پہونچا تو انہوں نے یہ کتاب بہت ہی محبت وخلوص کے ساتھ مجھے بطور تحفہ دی اور بہت ساری دعاوں کے ساتھ وداع کیا۔ اس کتاب کے مطالع کے بعد یہ خیال دل میں آیا کیوں نہ اس پر تبصرہ کر کے اسکا حق ادا کروں۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور سات ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں عہد شاہجہانی پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ چندر بھان برہمن کی حیات و کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلے باب میں شاعر کے فارسی قصاید شامل کئے گے ہیں جنکی تعداد ۵ ہے، دوسرا باب ۷ مثنویات پر مشتمل ہے جنہیں شاعر نے خود ہفت بحر کا نام دیا تھا ان کے عناوین خالص صوفیانہ اور رب کریم کے اسماء پر رکھے گئے ہیں (مثلاً ہو، ہوالرحمٰن، ہوالرحیم، ہوالمستعان، ہوالغنی، یا حفیظ تعالیٰ شانہ، اور ہواالفرد)، تیسرے باب میں غزلیات ہیں جنکی تعداد ۳۴۲ ہے۔ چوتھے باب میں ۵۴ رباعیات شامل کی گی ہیں۔ پانچواں باب شاعر کے متفرق کلام، چھٹا باب متفردات اور ساتواں اور آخری باب اردو کلام پر منحصر جس میں صرف ایک غزل ہے۔

مذکورہ تصنیف شاعر، اس کے عہد، اس کے کارناموں اور اس کی شاعری کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ چندر بھان برہمن ایک کثیر التصانیف مصنف تھا شاعری کے علاوہ اس کی تصانیف میں چہار چمن، تحفۃ الفصحا، مجمع الفقراء، کارنامہ، تغزیٰ بادشاہ شاہجہاں، نادر نکات، رقعات برہمن ہفت گلشن، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ فارسی زبان وادب کے پہلے ہندو صاحب دیوان شاعر کے لئے یہ تصنیف ایک بہترین خراج عقیدت ہونے ساتھ ساتھ ہم جیسے طلباء تحقیق کے لئے بھی ایک بہترین ورثہ ادب ہے۔

تصنیف: **عہد خلجیان ہند کی نمائندہ فارسی منثورات** مصنف: **پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید**

صفحات: ۲۶۹ مبصر: **محمد توصیف خان کاکر**

ملنے کا پتہ: پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

زیر تبصرہ کتاب پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید کی تالیف ہے جس میں جیسا کہ عنوان کتاب سے روشن ہے عہد خلجی کی نمائندہ فارسی منثورات کا تعارف اوران سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے، زیر نظر کتاب ''حرف زراندود'' از پروفیسر آذرمی دخت صفوی سے شروع ہوتی ہے سپس دیباچۂ کتاب کا آغاز ہوتا ہے، دیباچہ میں مولف نے خلجی حکمرانوں کے تعارف اوران کے عہد کے خاص واقعات پر اختصاراً خامہ فرسائی کی ہے۔ بعدہ، باضابطہ کتاب کا آغاز عہد کے سیاسی، فرہنگی اورادبی منظر نامہ سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرے باب میں شبہ قارۂ ہند میں فارسی نثر کے ورود وارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں منثورات حسن سجزی اور چوتھا باب منثورات امیر خسرو پر منحصر ہے۔ جیسا کہ قبلاً کہا گیا تیسرے باب میں حسن سجزی کے احوال وآثار بیان کئے گئے ہیں اوران کے نثری کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے جس میں فوائدالفواد اور مخ المعانی شامل ہیں قدرے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

فوائدالفواد کے ذیل میں مولف نے مذکورہ کتاب کے بعض اہم موضوعات مثلاً مشغولی حق، عشق وعقل، تزکیہ وقبول نفس، ادب وآداب خدمت پیر، نگاھداشت پیر، اطاعت شیخ، ترک وتجرید، ترک دنیاولذات دنیا، ترک وطن ومحبت خانہ، صبرورضاوتوکل وغیرہ پر علیحدہ شرح بھی لکھی ہے جواز خود اہمیت کی حامل ہیں یہ تشریحات اس لئے بھی اہم ہیں کہ ان میں مولف کے شخصی نظریات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اورسب سے اہم بات یہ کہ فوائدالفواد جیسی کتاب پر جس تفصیل سے مولف نے لکھا ہے دوسری جگہوں پر شاید ہی دیکھنے کو ملے اس طرح یہ ایک سیر حاصل تبصرہ قرار پاتا ہے اس کا مطالعہ یقیناً مفید ہے۔ چوتھے باب میں امیر خسرو احوال وآثار کے ساتھ ان کی دو کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جس میں اعجاز خسروی، خزائن الفتوح شامل ہیں ان دونوں کتاب پر بہت مفصل بحث کی گئی ہے۔ اعجاز خسروی جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کئی رسائل کا مجموعہ ہے جو رسائل خسروی کے نام سے بھی مشہور ہے مولف نے ہر رسالے کا جداگانہ تعارف اوران پر مفصل بحث کی ہے اس کے بعد خزائن الفتوح یا تاریخ علای پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ آخراً یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ فوائدالفواد، مخ المعانی جیسے عرفانی آثار پر بہت تفصیلی تبصروں کے باعث کتاب میں عارفانہ رنگ غالب ہے لیکن چونکہ خلجی عہد سے متعلق یوں بھی بہت کم لکھا گیا ہے اور بالخصوص اردو میں اس دور سے متعلق کتابیں مفقود ہیں لہٰذا یہ کتاب غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اور ہم مولف سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی ہماری گراں بہا تاریخ کے فراموش شدہ ادوار پر خامہ فرسائی فرمائیں گے اور ہم تشنگان علم اس سے مستفیض ہوں گے:

ما ہمه تشنه لبانیم و توئی آب حیات! لطف فرما، که ز حد میگذرد تشنه لبی (قدسی مشہدی)

☆☆☆

Quarterly Literary Journal

ISSN : 2394-5567

DABEER

(Peer Reviewed Refreed, Journal for Persian Literature)

Volume : 2 January to March 2015, S. No. 1

In the Memory of
Late Janab Dabeer Hasan Sb.

From : Dabeer Hasan Memorial Library

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Research Scholar, Dept. Of Persian, AMU, Aligarh

Ad.: Dabeer Hasan Memorial Library
12, Choudhri Mohalla, Kakori, Lucknow (U.P.) 226101

Mob. 09410478973, email:dabeerpersian@rediffmail.com